پاکستان: ہم بہاریوں کی یکطرفہ محبّت

ڈاکٹر رخشندہ پروین

PHOTO 1

Guerrilla Bayonets Prisoner

Abdul Kader Siddique, one of the leaders of the pro-independence Mukti Bahini forces, bayonets a prisoner accused of being a member of the pro-Pakistani Razakar paramilitary force, at a political rally in Dhaka, Bangladesh, two days after the Pakistani surrender at the end of the Bangladesh War of Independence, 18th December 1971. Four other men were beaten, tortured and killed in this way, with Siddique bayonetting three in total. Siddique went on to a career in Bangladeshi politics. (Photo by William Lovelace/Daily Express/Hulton-Deutsch Collection/CORBIS/Corbis via Getty Images)

PHOTO 2

Biharis pictured at the Mohammadpur refugee camp in Dhaka, Bangladesh on December 22, 1971: around 16 million people were internally displaced in Bangladesh following the events of the 1971 war | AP|

"While rape, torture, and mistreatment of our former Pakistani Bengalis have been widely documented and accepted, the stories of this most unfortunate community is mostly untold, hidden, concealed and misinterpreted." Dr. Rakhshinda Perveen

پاکستان: ہم بہاریوں کی یکطرفہ محبّت

ڈاکٹر رخشندہ پروین

جملہ حقوق

اس **ڈیجیٹل** کتاب کے مواد کو غیر تجارتی، تعلیمی اور تحقیقی مقاصد کے لیے نقل کیا جا سکتا ہے،
بشر طیکہ مصنفہ کا نام دیا جائے۔

نام ڈیجیٹل کتاب: پاکستان: ہم بہاریوں کی یکطرفہ محبّت

مصنفہ: ڈاکٹر رخشندہ پروین

Copyright Notice
The content of this digital book may be reproduced for non-commercial، educational، and research purposes، provided that proper acknowledgment is given to the author.

© Dr. Rakhshinda Perveen ،2024

Download your copy by visiting these links:
https://drrakhshinda.mystrikingly.com
www.creativeangerbyrakhshi.com.pk

Email: dr.r.perveen@gmail.com

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے
(پروین شاکر)

فہرست مضامین

تعارف: پاکستان: ہم بہاریوں کی یکطرفہ محبّت 7
1. ہر اک اجنبی سے پوچھیں جو پتہ تھا اپنے گھر کا 13
2. فلسطینیوں کے بارے میں بے قرار پاکستانی 17
3. میڈیا بلیک آؤٹ اور قطب الدین عزیز کی کتاب خون اور آنسو 20
4. ذکر زین العابدین کا: تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو 24
5. کہانی محبت کی؛"پاکستانی" اور بنگالی مشہور شخصیات 29
6. کراچی 5000 :نوجوانوں کو نہم اور دہم کے امتحان سے دور رکھنے کا اہتمام 34
7. ڈھاکہ: جنرل اعظم سے بابر اعظم تک 37
8. 16 دسمبر 1971؛ بنگال سے پاکستان آئی بہاری کمیونٹی کا درد کون سمجھے گا؟ 42
9. پاکستان آنے والے مہاجرین میں بہاری کمیونٹی کا درجہ دلتوں جیسا ہے 47
10. پاکستانی بہاری: بربادی کی ایک غمناک داستان 53
11. المیہ پاکستان: میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں؟ 58
12. پاکستان زندہ باد سے بیجوئے شو بھو جاترا تک 64
13. بنگلہ دیش میں کیا ہوا؟ 67
14. بنگلادیشی جنریشن زی اور ہم پاکستانی۔ فرق جان کر جیو پلیز 71

15. بنگلہ دیش اور پاکستانی بہاری: حقیقت، خاموشی، اور فکر............................75

16. آٹوگراف اور انسان 79

17. ڈائنوسار کی ڈائری سے ایک ادھورا صفحہ 85

18. نہتے بہاریوں پر گزری قیامت کون بیان کرے گا؟ 90

19. ڈھاکہ والا گھر اور بھٹو صاحب 95

20. پاکستانی دانشمندوں کی "ہمدلی برائے پاکستانی بہاری محصورین" اور ٹرمپ کا امریکہ 100

21. جو رہی سو بے خبری رہی۔ بہاریوں کی پاکستان سے یک طرفہ محبت 107

22. ہرے سے گہرے ہرے رنگ کے پاسپورٹ تک ایک نوبل انعام یافتہ معاشی سائنٹسٹ کی کہانی...117

23. بہاری المیہ: تاریخ کا بھولا باب 121

24. تذلیل، توہین اور گمشدہ شناختوں کے 19,359 دن 148

تعارف:

پاکستان: ہم بہاریوں کی یکطرفہ محبّت

اس ڈیجیٹل تالیف میں کل چوبیس کالم / بلاگس کا انتخاب شامل ہے جو دسمبر 2022 سے ۹ دسمبر 2024 کے دوران لکھے گئے۔ ان کا محور بھلا دیے جانے والے بے بس، بے در اور بے شاخت "پاکستانی" بہاری / غیر بنگالی اردو اسپیکرز ہیں۔ بنگلہ دیش کے حالیہ واقعات یعنی شیخ حسینہ واجد کی بھارت نواز حکومت کے خاتمے اور نئے منظرناموں کے حوالے سے بھی کچھ تاثرات اور تجزیے ہیں۔

16 دسمبر 1971۔ 16 دسمبر 2024 تک۔ تذلیل، توہین اور گمشدہ شناختوں کے 19,359 دن ہیں۔ اور بے زمین سے بے وطن ہونے تک کی بے امان لوگوں کی فریاد نہ کوئی سننے والا ہے نہ سنانے والا۔

ڈھاکہ اور اس سے باہر 7x7 کے ڈربوں جن کو کیمپوں کا نام دے دیا گیا ہے میں "زندگی" بسر کرنے والے تین لاکھ سے زائد انسانوں کے لیے، 16 دسمبر جیسی تاریخ بنگلہ دیش میں کسی فتح کے جشن کی نہیں بلکہ صبر آزما یادوں کی علامت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بزرگ پاکستان کے عُشّاق رہے ہیں اور پاکستان کو قائم رکھنے کے لیے پاکستان کی فوج کے ساتھ وطن بچانے سامنے آ گئے۔

ان میں زیادہ تر اکثریت بہاریوں کی ہے تاہم ان میں یو پی، سی پی اور متحدہ ہندوستان کے دیگر علاقوں سے 1947 کے بعد میں آنی والی قومیتوں کے لوگ بھی شامل ہیں اور یہ سب، زیادہ تر اردو بولنے والے مسلمان ہیں۔

یہ لوگ کبھی مشرقی پاکستان (جو اب بنگلہ دیش ہے) میں فخر سے پاکستانی کے طور پر رہتے تھے۔ 1971 کے ہنگامہ خیز واقعات کے دوران انہیں ناقابل تصور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، تشدد سے بھاگتے ہوئے اسی جگہ ڈس پلیسڈ لوگوں کی فہرست میں آ گئے جسے وہ اپنا وطن سمجھتے تھے۔ لیکن ان کا المیہ نظر انداز کیا گیا، ان کی آوازیں وسیع سیاسی بیانیوں اور مصلحتوں کے درمیان دب گئیں۔

ڈھاکہ، دیناج پور، چٹاگانگ، سنت نگر، کھلنا، راجشاہی، سلہٹ اور دیگر شہروں اور قصبوں میں بہاری خاندانوں کو 1971 کی بنگلہ دیش کی "آزادی کی جنگ" کے دوران ناقابل بیان اور ہولناک تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کے حامی بہاری اور کچھ دیگر غیر بنگالی اردو بولنے والے انتقام کا نشانہ بنے۔

یہ انتقام ان سے ان کے اپنے ہی مسلمان بنگالی بھائیوں نے لیا۔ وہ عام بنگالی، جو مغربی پاکستان کے اشرافیہ کے ہاتھوں ذلت کا شکار ہوئے تھے ان کا غصّہ ان کی بعد میں مکتی باہنی کے طور پر ایک علیحدہ وطن کے لیے لڑنے کی تربیت میں کام آیا۔

ہماری بہاری اور غیر بنگالی خواتین کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ حاملہ خواتین بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اور یہاں تک کہ شکم مادر میں بچوں کو بھی معاف نہیں کیا گیا۔ زندگیاں برباد ہو گئیں، اور شناختیں چھین لی گئیں۔

دسمبر 1971 میں مکتی باہنی نے بہاریوں کے گھروں میں گھس گھس کر عورتوں کی آبرو ریزی کی اور مردوں کو بیدردی سے مار ڈالا تھا۔ اس کمیونٹی کی نسل کشی پر مجرمانہ خاموشی ہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب "پاکستان کیوں ٹوٹا" میں لکھتے ہیں کہ کہ بھیرب بازار میں بنگالیوں نے بہاری عورتوں کا ننگا جلوس نکالا تھا۔ وہ سرعام ریپ کرتے جاتے تھے اور قتل کرتے جاتے تھے۔ مارنے کے بعد ان کی شرم گاہوں میں بنگلہ دیش کے جھنڈے کی لکڑی گاڑ دیتے تھے۔

قطب الدین عزیز ایک معروف پاکستانی صحافی، مصنف اور سفارت کار تھے جنہوں نے پاکستان کی تاریخ اور بین الاقوامی تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ خاص طور پر اپنی کتاب "بلڈ اینڈ ٹیرز" (Blood and Tears) کے لیے مشہور ہیں، جس میں انہوں نے 1971 کی جنگ کے دوران مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے مظالم اور انسانیت سوز واقعات کو دستاویزی شکل دی۔ یہ کتاب ان ۱۷۰ ابرباد افراد کے انٹرویوز پر مبنی ہے جو اس دور میں متاثر ہوئے اور مغربی پاکستان میں "پناہ" لینے پر مجبور ہوئے۔ قطب الدین عزیز نے نہ صرف ان مظالم کو اجاگر کیا بلکہ اس کتاب کے ذریعے دنیا کے سامنے ایک مختلف بیانیہ پیش کرنے کی کوشش کی، جو ان واقعات کو ایک مختلف زاویے سے دیکھتا ہے۔

افسوس صد افسوس کہ سابقہ مشرقی پاکستان کے 55 شہروں میں مارچ۔ اپریل 1971 میں عوامی لیگ کے جنگجوؤں اور دیگر باغیوں کے ہاتھوں مغربی پاکستانیوں، بہاریوں، اور دیگر غیر بنگالیوں اور پاکستان کے حامی بنگالیوں پر ڈھائے گئے مظالم کے 170 گواہان

کی یہ شہادتیں نہ کبھی مین سٹریم میڈیا پر بیان کی گئیں نہ ہی یونیورسٹی، کاکول یا سول سروس اکیڈمیز میں پڑھی یا پڑھائی گئیں۔

سولہ دسمبر 1971 کو باضابطہ ہتھیار ڈالے گئے۔ پاکستان دولخت ہوا، سقوط ڈھاکہ پر اب تک نصاب تک میں سکوت ہے۔ اس کمیونٹی کو جو پاکستان کے جھنڈے سے دستبردار نہیں ہوئی انتہائی بے دردی سے قتل کیا گیا۔ یاد رکھیں مسلمان بنگالیوں نے مسلمان بہاریوں کا قتل کیا، چاہے ان کی ٹریننگ انڈیا نے کی ہو، لیکن اپنے ہی غیر بنگالی بھائی، بہنوں، کو لیگز پر بندوق مسلمانوں نے ہی تانی تھی۔ ان مسلمان بنگالی قاتلوں کو فریڈم فائٹرز کہا جاتا ہے اور نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ دنیا کے کئی ملکوں میں ان کو بے تحاشہ عزت اور تکریم دی گئی ہے۔

ہم لوگ کس کو سمجھائیں کہ صرف جغرافیہ نہیں بدلا ہماری شناخت اور حیثیت بھی بدلی۔ کیسا بدلہ لیا بنگالیوں نے؟ شکوہ پاکستان کے مراعات یافتہ طبقے سے جن کے ظلم کا شکار غریب پنجابی تک ہے اور برق گرائی گئی تو ہم امن پسند پڑھے لکھے مڈل کلاس اور محنت کی روزی کمانے والے بہاریوں پر۔

میڈیا کی پابندیوں کے دوران شہری بہاریوں اور ان کی نسل کشی کی کہانی ثابت قدمی کی ہے، جنہوں نے مشکلات کے باوجود اپنی بقا کی جنگ لڑی اور اس معاشرے میں ضم ہونے کی کوشش کی جو اکثر انہیں مسترد کرتا ہے۔ یہ وہ وراثتیں ہیں جو ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی گئیں جو زندہ بچ گئے۔

ہمّت کر کے یہ چند مضامین پڑھ لیں اور سوچیں آپ نے اس کمیونٹی کے لیے کیا کیا اور آپ کیا کر سکتے ہیں ؟

بہت شکریہ

پس تحریر : آج کل پڑھنے کا رواج کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ مجھ سے بھی کہا گیا کہ کون یہ سب کچھ پڑھے گا۔ ایک یا دو سطروں میں بات کیا کریں۔ **تو ہماری مختصر ترین بپتا:**

ہم نے پاکستان کی خاطر بنگالیوں کا قہر سہا اور پاک فوج نے جب ہتھیار ڈال دیے اور پاکستان ٹوٹ گیا اور بنگلہ دیش اور بقیہ پاکستان کے دو الگ الگ حکمران بن گئے تو ہم محب وطن لوگوں کو دھتکار دیا گیا اور کہا گیا کہ ادھر ہی رہو وہی تمہارا وطن ہے یعنی انہی بنگالیوں کے ساتھ جنھوں نے قتل کیا ریپ کیا روزگار اور شناخت کو تباہ کیا ان ہی کے ساتھ بغیر کسی دعوی کے مداوے کے عدم برابری کے ساتھ رگڑ رگڑ کر زندگی کی سانسیں پوری کرو۔ یہ ہے ہماری یکطرفہ محبّت اور بربادی کی کہانی۔

ڈاکٹر رخشندہ پروین

اسلام آباد ۔ پاکستان

16 دسمبر 2024ء

(1)

ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

https://ibcurdu.com/news/152589/
نومبر 19، 2023

شائد اگست کا مہینہ تھا سال تھا 1984 مجھے فی البدیہ اردو مباحثے میں پہلا انعام ملا اور انعام میں جو دو کتابیں تھیں وہ فیض کی تھیں ”دست صبا“ اور ”مرے دل مرے مسافر“۔

مرد مومن مرد حق المعروف ضیاء الحق کا عہد تھا۔ فیض صاحب ان دنوں شاید پی ٹی وی پر بین تھے۔ جوش ملیح آبادی کی طرح جن سے ہمارے گھریلو سطح کے تعلقات تھے۔ ان کے گھر آنا جانا تھا اور ابّو کے پاس اس ”جرم“ کی پاداش میں کئی اجنبیوں کا آنا جانا لگ جاتا تھا۔ جوش صاحب کے حوالے سے چند مدہم مگر دلچسپ بھی اور دل فگار سی یادیں ہیں وہ پھر سہی۔۔۔

نومبر کا مہینہ ہے اور فیض صاحب کے ذکر کے بغیر شاید گزارنا مشکل ہو میرے جیسے بیوقوف کے لیے، جو سوچتی ہے کہ کاش کوئی 16 دسمبر کی منحوس تاریخیں کیلنڈر سے نکال سکتا۔۔۔ پہلے 16 دسمبر 1971 کا غم کیا کم تھا کہ 16 دسمبر 2014 کا سانحہ بھی

سہنا پڑ گیا۔ اس لیے دل ضد کرتا ہے کہ سال نومبر میں ختم ہو جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔ اگر زندگی کی حقیقت ایک سپنا ہے جو ختم ہو جانا ہے تو کیوں نہ یہ سپنا خوبصورت ہو، رومانٹک ہو، کامیڈی ہو، ہارر کیوں ہو؟

لیکن میری چاہت یا چاہ سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حکمت کو میں کیا جانوں؟ لہٰذا اپنی بے بسی اور بے طاقتی کے حصار میں رہتے ہوئے ایف ایس سی کے زمانے کی ایکس ٹیسی کو یاد کر رہی ہوں۔ میں نے اس سمے سوچا تھا کہ میں فیض صاحب سے ان کی سالگرہ پر ملوں گی۔ کیسے؟ یہ نہیں سوچا تھا، اچھا وقت تھا۔ کچھ سوچیں تو آزاد تھیں۔ آج کے دور میں تو میرے جیسوں کو اپنی اوقات ہر وقت ہی یاد رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ فیض امن میلا میں کبھی بھی نہ بلانے جانے کا غم نہ ہو، اس وقت لگتا تھا کہ میں بھی مخلوق خدا ہوں اور میں بھی راج کروں گی۔

یہ بھی سوچا تھا کہ فیض صاحب سے پوچھوں گی کہ آپ نے فلسطینی بچے کی لوری لکھ کر اپنے کمزور دل پاکستانی پرستاروں کو اتنا کیوں رلایا؟

بہت ساری باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں پھر اب باصفا کون ہے، شہر جاناں سے ان کے پاکستان سے ان کو واپس لے جانے کوئی نہیں آیا جو کسی طرح آ گئے تھے۔ ان کی نمناک داستان سننے کی نہ کسی کو ضرورت ہے نہ ہی فرصت۔۔

20 نومبر 1984 کو فیض کو اللہ نے ہمیشہ کے لئے وطن بدری سے بچا لیا اور لاہور میں آسودہ خاک کر دیا۔

میں نے ان کی یاد میں جاری ہونے والا ایک پوسٹر کہیں سے حاصل کیا، جس پر ان کے یہ اشعار کندہ ہیں۔

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

39 برس ہونے کو آئے، وہ پوسٹر میرے ساتھ نگر نگر گھوما لیکن میرے سوالات میں اپنی بہارئی کمیونٹی کے ساتھ ہونے والی دھاندلی کے حوالے سے کئی سوالات بھی شامل ہو گئے۔

کاش فیض صاحب نے بتایا ہوتا کہ خون کے دھبے برساتوں کے بعد بھی نہیں دھلتے لیکن شاعر کا کام شاعری ہوتا ہے، ایکشن پلان دینا نہیں چاہے وہ کتنا ہی بڑا دانشور ہو یا امن کا شیدائی۔

ادب اور ادیب کو الگ الگ رکھ کر دیکھنا چاہیئے ورنہ مایوسی ہوتی ہے، فیض صاحب نے زبردست کلام عطا کیا جس کے ایک اہم حصّے کو مہدی حسن، نور جہاں اور اقبال بانو نے دوام بخشا ہے۔

فیض صاحب کا کلام ایلیٹ کلاسس کے ایلیٹ طریقے کے ایکٹ وزم میں بھی کام آتا ہے۔ انہوں نے خواب میں بھی ایسا سوچا نہ ہو لیکن گردش زمانہ۔۔۔

یہ نومبر بھی گزر جائے گا اور پھر دسمبر آجائے گا۔ نہیں آئیں گے تو وہ معصوم جو اے پی ایس پشاور میں ٹیر رازم کا شکار ہوئے یا وہ مظلوم بہاری جن کی چوتھی نسل بھی ڈھاکہ اور دیگر شہروں کی سانس کو بند کر دینے والے تنگ بدبودار "کیمپ" نما پنجروں میں ایک نہ سمجھ میں آنے والی "زندگی" گزار رہی ہے۔ ان میں سے اکثر نے اپنے والدین اور ان کے والدین سے سنا ہو گا کہ متحدہ پاکستان میں وہ شہر میں اپنے گھر میں رہتے تھے۔

پاکستان نے تو ہمیں نظر انداز کر دیا۔ مجبوری ہوگی۔

حاکم شہر کی بھی مجمع عام کی بھی

بنگلہ دیش سے بھی سوال تو بہت ہیں۔ کاش جواب مل جائے

مساوات کے حوالے سے عدل کے حوالے سے شہریت کے حوالے سے مثال کے طور پر یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کہ آپ نے ان بدقسمت لوگوں کی جائیدادوں کا کیا کیا؟ کلیم نہیں کر رہے۔

بس بزبان فیض اتنا کہوں گی

ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

---

(2)

فلسطینیوں کے بارے میں بے قرار پاکستانی

https://urdu.nayadaur.tv/27.Oct.2023/24705
2023،27 Oct

عین ممکن ہے ترجیحات اور معاملہ فہمی بیک وقت حسینؑ سے بھی تعلق بنوا دیتی ہے اور یزید سے بھی یارانہ کروا دیتی ہے۔ بھلا بہاریوں اور فلسطینی عوام کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہی کیوں جائے؟ اکثریت بشمول دانشور طبقہ، بہاریوں اور اردو بولنے والے پاکستانیوں کو کمتر جانتی ہے۔ اپنے وسائل میں شراکت داری انہیں قبول نہیں۔

میں نے پاکستانی بہاریوں کے لیے لکھنا شاید بند کر دیا ہے، بولنا بھی کم کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں سمجھدار ہو گئی ہوں۔ ہوا یوں کہ ایک نئے منجدھار میں ہوں۔ بے ترتیب، بے ربط، ادبیت سے عاری، شعریت سے مبرا، مقبول صحافتی معیار سے کوسوں دور اور ان پیڈ ایکٹیوزم سے بھرپور۔ اس شکستہ دل اور دماغ (ہمیشہ ساتھ ہی رہے اور نرالی ترتیب میں دل میں دماغ رہا اور دماغ میں دل) میں بن بلائے مہمان کی طرح براجمان جوار بھاٹا کا کیا کروں؟

جی میں آتا ہے کہ پاکستانیوں کو داد دوں جو فلسطینیوں کے خلاف ظلم و بربریت پر کرکٹ میچ انجوائے کرتے ہوئے سخت غمگین اور غصے میں ہیں۔ جی میں یہ بھی آتا ہے کہ سوال کروں کہ کبھی مظلوم، بے گھر، بے وطن اور پاکستان سے غیر مشروط محبت

کرنے والی بہاری کمیونٹی کا بھی درد محسوس کیا؟ ان کے لیے بھی آواز اٹھائی؟ پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیتی ہوں۔ اپنی کم ظرفی کو پہچان کر مزید اداس ہو جاتی ہوں۔ اپنے آپ کو کمانڈ دیتی ہوں، ڈیلیٹ! مگر وہ جوار بھاٹا! کیا کروں؟ کیا کروں؟ کیا کروں؟ کیا کروں؟ کیا کروں؟

اضطراب کو کم کرنے کے لیے جرمنی کے اس سفر کو یاد کرتی ہوں جہاں ایک شہر میں ایک طرف تو انسانیت کو شرما دینے والے ستم ہوئے اور وہ شہر بے خبر رہا۔ وہ ظالم نازی اپنے بچوں اور خاندان کے لیے سراپا شفقت تھے۔

عین ممکن ہے ترجیحات اور معاملہ فہمی بیک وقت حسینؓ سے بھی تعلق بنوا دیتی ہے اور یزید سے بھی یارانہ کروا دیتی ہے۔ بھلا بہاریوں اور فلسطینی عوام کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہی کیوں جائے؟ اکثریت بشمول دانشور طبقہ، بہاریوں اور اردو بولنے والے پاکستانیوں کو کمتر جانتی ہے۔ اپنے وسائل میں شراکت داری انہیں قبول نہیں۔ یہ سوچنا بھی محال ہے کہ بنگلہ دیش میں محصور مزید تین سے چار لاکھ ان کے پاکستان میں پائے جائیں۔ لہٰذا بات ہی ختم رہی۔ فلسطینیوں کی طرف سے اس اسلامی قلعے میں پناہ لینے اور پھر نادرا سے الپاکستانی شناخت لینے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ سو ان کے لیے سوشل میڈیا پر بین ڈالنا اور وہ امداد جو ان تک کبھی پہنچ ہی نہیں سکتی، نہایت پریکٹیکل اور بے خطر چوائس ہے۔

بے ثمر آگہی سے زیادہ کربناک اور پیچیدہ کیفیت کیا ہو گی؟ میں تمام بے بس انسانوں کی طرح اللہ کے ذکر میں پناہ ڈھونڈتی ہوں۔ ملالہ کے بیانیے سے انسپائر ہونے کی شعوری کوشش کرتی ہوں۔ تمام نوبل پرائز برائے امن کے منطقی رویوں کو سمجھنے کی ناکام کوشش

کرتی ہوں۔ مہذب ممالک کے ویزے ملنے میں کوئی مشکل نہ ہو، اس لیے کوئی بے ضرر سی ٹویٹ تک نہیں کرتی۔

اللہ جانتا ہے کہ میری بے بسی اس کی بادشاہی جتنی لامحدود ہے۔ خدا تُو خاموش ہے۔ خدایا یہ ناقابل فراموش ہے۔

---

(3)

میڈیا بلیک آؤٹ اور قطب الدین عزیز کی کتاب

خون اور آنسو

https://thescoop.pk

06/02/2024

آج چھ فروری 2024 ہے اور واٹس ایپ پر پیغامات آرہے ہیں کہ سات فروری 2024 سے پاکستان میں انٹرنیٹ بند ہو جائے گا اور نو فروری 2024 کو کھل جائے گا۔ اس دوران آٹھ کو جنرل الیکشن کا انعقاد ہو جائے گا۔ اس خبر کو بھی نظر انداز کر دینا چاہیے یا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کم از کم میرے جیسوں کو جن کو کوئی شائد ڈھنگ سے سماجی حصّہ داروں میں شمار بھی نہیں کرتا۔

جن خواتین اور حضرات کو بولنے اور لکھنے کا معاوضہ ملتا ہے یا جن کی این جی اوز ان امور پر فنڈز حاصل کرتی ہیں وہ بھی زیادہ نہیں چلا رہے بلکہ کسی اچھی جگہ چل کر رہے ہیں تو اپنا جھنجلانا یا جی جلانا اور بھی بے وجہ لگتا ہے۔ لیکن جب تین عشروں سے سماجی اور سیاسی امور کو صنفی لینس سے پرکھنے کی عادت ہو اور بے مایہ کمیونٹی کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ اور جنون ہو تو لاتعلق رہنا محال ہو جاتا ہے۔ یہی ہمدلی خود کو رلاتی ہے اور ذہن کو سوالات کرنے سے منع کرنے سے ناکام رہتی ہے۔

میں بھی کئی دنوں سے اپنے آپ کو جلا رہی ہوں کہ اب کی بار کئی بڑی سیاسی پارٹیز کی طرف سے خواتین امیدواروں کی تعداد الیکشن کمیشن کی مقرر کردہ لازمی پانچ فی صد سے مجموئی طور پر کم ہے، یاور کرز کو ہمیشہ کی طرح کم کم ہی ٹکٹ ملے یا غیر مراعات یافتہ طبقے کی نمائندگی یا اقلیت کی نمائندگی یا عام خواتین کی نمائندگی اور الیکشن کے حوالے سے کئی معاملات میں ان کی شمولیت یا شراکت مدھم ہے' یار سمی یا ٹوکنِسم کا کلاسک کیس ہے۔ حالانکہ کچھ گنے چنے خیر خواہ جو میرے پاس ہیں ان کی رائے کے مطابق تو مجھ کو اپنی بڑی عمر اور اس سے بھی بڑے نشیب و فراز دیکھنے کے پیش نظر اور خود کی زندگی کسی سٹار پلس کے ڈرامے سے بھی زیادہ ڈرامیٹک ہونے کے بعد پاکستان کی کسی بھی ادا پر نا تو حیران ہونا چاہیے اور نا ہی پریشان اور نا ہی خوش گمان کہ کچھ لکھنے سے کہنے سے کچھ بدلے گا۔

سموسے کھاتے، قہقہے لگاتے، تاریخ سے نا آشنا یا سلیکٹو اڈ و کیسی کو صحافت کا لبادہ اوڑھائے ہُوئے، بے لگام، بے باک، آزاد ماہرین ابلاغ کو ٹی وی چینلز پر بولتے دیکھ کر نجانے کیوں میں مزید بکھر جاتی ہوں۔ بس یونہی 1970 کے 1 نتخابات کی جانب دھیان چلا جاتا ہے۔ کرب کی کیفیات میں سوچوں کا ایک ریلا سا ساتھ رہتا ہے۔ میں کتابوں میں عافیت تلاش کرتی ہوں۔ کتاب بینی نا صرف انٹلیکچوئل تنہائی کی ساتھی ہوتی ہے بلکہ میڈیا اور سماجی ترقی کی انڈسٹری سے منہا کر دیے جانے کی تذلیل اور توہین کے احساس کو بھی نئ توجیہ دے دیتی ہے۔

میں آج کل ایک کتاب جو پاپولر یاداشت میں نایاب ہے اور نامی گرامی دانشوروں اور صحافیوں کی ریڈنگ لسٹ سے خارج ہے دوبارہ پڑھ رہی ہوں۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ خون اور آنسو جس کو کمال کے صحافی اور سفارت کار قطب الدین عزیز نے تحریر کیا تھا۔ (اسے ردو کے قالب میں ڈھالنے کا سہرا کراچی کے ایک ادارے معارف اسلامی کے سر ہے)۔ آج کا بلاگ 1974 میں شائع ہونے والی ۳۳۳ابواب پر مبنی اس اہم تصنیف جس میں اکہتر میں محب وطن غیر بنگالیوں (بیشتر بہاری) اور بنگالیوں کے ساتھ ظلم کی شواہد پر مبنی داستانیں ہیں اور پاکستان کی بقا کے لیے فنا ہونے والی بہاری قوم کی نسل کشی اور ان کے ساتھ ہونے والی بربریت قلمبند ہے۔ کے متعلق تو نہیں ہے۔ دل پھر بھی ضد کر رہا ہے کہ ایک اقتباس آپ کی خدمات میں پیش کر دوں:

”مارچ 1971ء کے تیسرے ہفتے میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے عسکریت پسندوں کے مظالم سے بچ کر پانچ ہزار پاکستانی بحری جہاز کے ذریعے چاٹگام سے کراچی پہنچے۔ انہوں نے مظالم کی جو کہانیاں سنائیں، ان کا ایک لفظ بھی مغربی پاکستان کے پریس میں شائع نہیں ہوا۔ ایک اخبار نے ”ہمت“ دکھاتے ہوئے یہ ”خبر“ دی تھی کہ مشرقی پاکستان میں حالات معمول پر ہیں۔ گویا پانچ ہزار افراد معمول کی صورت حال سے گھبرا کر وہاں سے نکل بھاگے تھے! مارچ ۱۹۷۱ء کے دوران ہزاروں غیر بنگالی ڈھاکا ایئرپورٹ پر فوج کی نگرانی میں پڑے رہے تاکہ اپنی اپنی باری آنے پر مغربی پاکستان منتقل ہو سکیں۔ مشرقی پاکستان سے آنے والوں کے ساتھ تابوتوں میں عوامی لیگ کے

عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مارے جانے والے فوجیوں اور عام غیر بنگالی پاکستانیوں کی لاشیں بھی کراچی ایئرپورٹ پہنچتی تھیں مگر اس حوالے سے مقامی یا بین الاقوامی پریس میں کوئی خبر شائع نہیں ہوتی تھی۔ ڈھاکا ایئرپورٹ پر فوج کے پہرے میں طیارے پر سوار ہونے کے لیے باری کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں بھی کوئی خبر کہیں شائع نہیں ہو پاتی تھی۔ کراچی ایئرپورٹ پر لاشیں وصول کرنے والوں کی آہ و بُکا کی خبر اخبارات میں اِس لیے شائع نہیں ہو پاتی تھی کہ وفاقی وزارتِ اطلاعات و نشریات نے ایسی خبروں پر سختی سے پابندی عائد کر رکھی تھی“۔

میری کیا بساط اور کیا اوقات؟ کچھ نہ کچھ اس لئے لکھ دیتی ہوں کہ شائد کسی کو کچھ عملاً کرنے کی توفیق ہو جائے اور شائد اللہ ہم سب کو معاف کر دے۔

(4)

ذکر زین العابدین کا: تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو

https://ibcurdu.com/news/153886/

فروری5، 2024

ایک عرض تمنا ہے وہ آپ کی خدمات میں پیش ہے۔ اس تحریر کو تاریخ، سیاست، نفسیات، آرٹ اور آزادی کی تحریکوں کے ہر ایماندار اور باشعور طالب علم کو پڑھنا چاہیے۔ اگر آپ پاکستان سے محبّت کرتے ہیں اور انسانی حقوق کی طرفداری بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو لبرل حلقوں اور میڈیا کے ساتھ بھی منسلک گردانتے ہیں تو میری مودبانہ استدعا ہے کہ آپ پر لازم ہے کہ آپ یہ الفاظ غور سے پڑھیں اور سمجھنے کی شعوری کوشش کریں۔

شائد عنوان دیکھ کر کئی ذہنوں نے سوال کیا ہو کہ کون ہیں یہ ؟ یا جن کو نام سے کچھ یاد آرہا ہو، وہ سوچ میں پڑ گئے ہوں کہ کون سے والے ؟ زین العابدین ایک ایسا نام ہے جو ہمارے خطّے میں بہت معروف ہے لیکن بنگال کے مسلمانوں میں یہ نام بہت عام ہے۔ آج میں آپ کو اس نام سے شناخت حاصل کرنے والی تین مختلف شخصیات سے ملواؤں گی۔ ان کے درمیان کیا قدر مشترک ہے اور کیا فرق ہے وہ آپ خود ہی اخذ کر لیں گے۔

زین العابدین۔ ایک قدآور مصور، بنگلہ زبان کی تحریک کے کارکن اور پاکستان سے علیحدہ ہونے کے لیے آج کے بنگلہ دیش میں ایک مجاہد آزادی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

یہ دسمبر 1914 میں اسی میمن سنگھ میں پیدا ہوئے، جہاں متحدہ پاکستان کے حق میں بہاری قوم کا قتل عام ہوا اور اس محب وطن کمیونٹی کی عورتوں کو جنگی ہتھیار کے طور پر انڈیا کے تربیت یافتہ بنگالی نوجوانوں نے بطور مکتی، باہنی، جنسی وحشت اور بربریت کا نشانہ بنایا۔

میں آج بھی انسانی نفسیات کے اس پہلو سے پریشان اور خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ فوجوں کو تو ہر طرح کے ہتھیار سے "کھیلنے" کی تربیت دی جاتی ہے، (جس میں جنگی جرائم بھی شامل ہیں اور کسی طور بھی جائز نہیں لیکن جنگ تو خود ایک جرم ہے؟ شائد اس پر بات کسی اور بلاگ یا کلام میں کی جائے)۔ حقوق کی سلبی اور محرومی کا احساس ایک آرٹسٹ ایک ایسے آرٹسٹ کو جس نے بنگال کے قحط پر اور انسانی المیوں پر شاندار پینٹنگز بنائی ہوں، کو بھی نفرت کی آگ کی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس عظیم آرٹسٹ مگر پاکستان کو توڑنے والوں کا ساتھ دینے والے فرد کی زندگی سے میں نے یہی جانا۔

کاش سنجیدہ، عظیم اور طاقتور افراد اور ادارے اس اہم سمت میں بھی گہرائی سے سوچیں کہ وہ کون سے محرکات ہوتے ہیں جو ایک آرٹسٹ کو بھی تشدد پسند یا شدت پسند بنادیتے ہیں اور ان کا سدباب کس طریقے سے کرنا چاہیے؟

زین العابدین۔ مکتی باہنی

ان کا پورا نام محمد زین العابدین ہے۔ ببانگ دہل اپنے آپ کو پاکستان توڑنے والے بنگلا دیشی مسلمانوں میں شامل کرتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی اور محقق کہلاتے ہیں اور انٹرنیٹ پر موجود معلومات کے مطابق امریکا میں مقیم ہیں اور امریکی شہری بھی ہیں۔ رااور بنگلہ دیش کے عنوان کے تحت ان کی ایک انگریزی کتاب بھی ہے۔ 1971 میں بحیثیت سٹوڈنٹ لیڈر سابقہ مشرقی پاکستان سے انڈیا گئے اور مکتی باہنی بن کر واپس آ گئے۔

مکتی باہنی کون تھے کیا تھے اور انہوں نے کیا کیا ؟

نہتے شہریوں جن کی زیادہ تعداد بہاریوں پر مشتمل تھی(گو کہ ان میں جناح کے پاکستان سے محبّت کرنے والے دوسری مسلمان قومیتوں، لسانی گروہوں خاص کر محب پاکستان بنگالیوں کی تعداد بھی تھی) پر وہ وہ ظلم ڈھایا گیا کہ سوچ کر بھی روح کانپ اٹھتی ہے لیکن ظلم کی تشریح کرنے والے پاکستان کے وہ دانشور اور غیر سرکاری تھنک ٹینک جو انسانی حققوق اور فمنسم کی آڑ میں وطن کو بدنام کرنے اور مشکلات میں دھکیلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اس حوالے سے گنگ ہیں۔

محمد زین العابدین گزشتہ کئی سالوں سے ایسے خیالات کا پرچار کر رہے ہیں، جس میں انڈیا کی علاقائی بالادستی سے ان کی بیزاری اور پریشانی جھلکتی ہے گویا وہ اپنے بنگلہ دیش کے داغ داغ اجالے سے دکھی ہیں۔ مکتی باہنی کی لغت کے حساب سے اپنی اور اپنے جیسوں کی "محنت"، "قربانی" اور "عداوت" پر مبنی انسانیت سوز مظالم کے

رائیگاں ہونے پر حیران اور دل شکستہ ہیں۔ کاش یہ صاحب شر مسار بھی ہوتے۔ کاش وہ یہ بھی سوچتے کہ اشرافیہ کے معمولات اور طرز حکمرانی سے ناراض ہو کر انھوں نے عام انسانوں پر کیا ستم ڈھایا؟ ان کی نسلیں تباہ کر دیں، ان کو اس طرح برباد کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی لیکن ہم ان کو کچھ ایسا سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

البتہ پاکستان کی لیے یہ سوچنا ناقابل گزیر ہے کہ اس کے نوجوانوں کو جو اس کی آبادی کا سب سے بڑا حصّہ ہیں کوئی دشمن بھڑکانے کی طاقت اور تاثیر تو نہیں رکھتا؟ کہیں ایسا ہو تو نہیں رہا؟ کہیں پر مظلوم، معتوب، محکوم اور مجبور نوجوان کسی بہکاوے، دھونس یا ترغیبات کا نشانہ تو نہیں بن رہے؟ کیا ان کو استعمال کر کے ملی سلامتی کو ناقابل تلافی نقصان تو نہیں پہنچ رہا؟

زین العابدین۔ زینو بھائی

پاکستان کے مشرقی پاکستان میں روزنامہ جنگ کے نمائندہ تھے۔ بقلم ایک بہادر بہاری مصنفہ اور مصورہ محترمہ شبانہ نوید ”جن کا ایک تعارف اردو کے ایک بہت اچھے شاعر نوشاد نوری کی دختر ہونا بھی ہے“۔ زین العابدین بہترین و اعلی افسانہ نگار تھے۔ ہندو پاک ادبی حلقوں میں اچھی پزیرائی تھی۔ چونکہ بنگلہ دیش میں رہ گئے اس لئے ان جیسوں کی ادبی خدمات ابھر کر سامنے نہیں آئی، دوسرے یہ لوگ درویش صفت بھی تھے۔ ایک افسانوں کا مجموعہ تک نہیں آیا۔

کاش کوئی پاکستانی ادب، فلم، صحافت، ابلاغ عامہ کے روشن ستارے کچھ وقت اس زین العابدین جن کو زینو یا زینو بھائی بھی کہا جاتا تھا، کے لیے نکال لیتے تو کتنا اچھا

ہوتا۔۔۔ شائد ہماری درس گاہوں کے اساتذہ کرام فیض کے مقبول کلام پر ڈھول باجوں کے ساتھ تھرکنے والوں اور والیوں اور سوشل میڈیا میں کہرام اور تہلکہ برپا کرنے والوں کو بھی پتا چل جاتا کہ 81 سال کی عمر میں تیس مارچ 2017 میں ڈھاکہ میں مرنے والا یہ دلیر زہین شخص کون تھا؟

کیوں انھوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے اور لسانی طور پر "اردو سپیکنگ "ہونے کے باوجود بنگلہ زبان کی تحریک میں بنگالیوں کا ساتھ دیا؟ کیوں پاکستان سے محبّت اس انداز سے کی کہ جب ملک دو ٹکڑے ہو گیا تو مشرقی حصّے کو پاکستان جانا؟ اور وہاں اس طرح رہے کے تمام انسان دوست لوگوں چاہے وہ بنگالی ہوں یا بہاری سب کے دل جیت لیے؟ کس طرح بنگلہ زبان کی حق کی پاسداری کی اور اردو زبان کو زندہ رکھا کہ باہمی رواداری اور مل جل کر رہنا ہی تو اصل انسانیت، لبرل ازم اور پاکستانیت ہے؟

پس تحریر: ایک خیر خواہ نما شناسا نے مجھ کو سمجھایا ہے کہ میں ایسے موضوعات پر نہ لکھا کروں کہ یہ غیر پیداواری اور قبولیت سے ناپید بیانیہ ہے۔ میں تو بزبان فیض یہی جواب دیتی ہوں کہ

تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو۔۔۔۔۔

---

(5)

کہانی محبت کی؛ "پاکستانی" اور بنگالی مشہور شخصیات

https://ibcurdu.com/news/155223/

اپریل 14، 2024

ایک دوست نے ایک مَرتَبہ میری پروفیشنل زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا کہ میں اپنے تخلیقی اور جدّت پسند خیالات اور کئی مہارتوں کے باوجود کامیابیوں کی ان منزلوں پر نہیں پہنچ سکی جو فی زمانہ قابل رشک جانے جاتے ہیں جیسے سینیٹر بننا، سرکاری ایوارڈز / اعلی ملازمت حاصل کرنا وغیرہ۔ پھر خود ہی اس کی وجوہات بیان کیں جن میں خرابی تقدیر سے جڑا نسلی و لسانی میک اپ تو تھا ہی اس کے علاوہ میری کمزوری یعنی نیٹ ورکنگ نا کرنے کا ہنر آنا یا مکھن کا جادو نا سیکھنا بھی شامل تھا۔ پھر یہ بھی فرمادیا کہ ایسی پروڈکٹ بیچو جو بہت منفرد ہو اور اس کی افادیت نظر آئے یا ایسے بیچو کہ کہ سب خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔ اپنی کمیوں کا اعتراف ہے۔ جو حاصل ہوا، وہ رب کریم کا کرم ہی ہے۔ ورنہ "ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے۔ بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا۔"

یہ کچھ آپ بیتی اس لئے بیان کی کہ آپ میں سے کچھ اس میں اپنی زندگی کی جھلک دیکھ سکیں۔ روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں ای میلز اور فون کالس موصول ہوتی ہیں۔ غیر اشرافیہ نوجوان اور ادھیڑ عمری کی جانب بڑھتی ہوئی خواتین سے ان کی ہنر مندی اور

بیروزگاری کا قصہ سنتی ہوں۔ مارے ندامت کے کھل کر بتا نہیں سکتی کہ جس سے مدد یا مشورہ مانگ رہے ہو وہ خود بھی حالات کی ماری ہوئی ہے۔ اللہ پردہ رکھتا ہے، ہمّت دیتا ہے۔ خود بھی محنت اور حوصلے سے زندگی گزاری ہے اور یہی بات آگے کرتی ہوں۔ کچھ مان جاتے ہیں، کچھ جان جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو صرف برا مان جاتے ہیں۔ میں سب کے لئے دعا گو ہوں۔ دل کا رنج بڑھتا جاتا ہے۔

سفارش کلچر اور بدیانتی نے ملک کے ہر ڈیپارٹمینٹ کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس لئے تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ انسانی ترقی کی رینکنگ میں وطن ہمارا بہت تنزلی کا شکار ہے۔ سماجی انصاف کی بات بہت کم سننے میں آتی ہے۔ منصفوں اور وکیلوں کی حالت اور قابلیت دونوں ہی کوئی راز نہیں ہیں۔ میڈیا نے رینکنگ اور ریٹنگ کو عام الفاظ اور تصور بنا دیا ہے۔ اور حاصل تمنا بھی۔ انسانی حقوق، غریبوں کے حقوق، مسترد شدہ لوگوں کے حقوق پر سوچنے اور سمجھنے سے کہیں زیادہ صحافیوں یا صحافی نما نمایاں افراد کے ٹی وی شو یا یوٹیوب پر ولوگس پر بحث ہوتی ہے۔ برانڈنگ عاشقی کی طرح مشکل، صبر آزما اور وقت طلب ہے چنانچہ زور اور توجہ مارکیٹنگ پر رہتی ہے۔ جو دکھتا ہے وہ بکتا ہے لہٰذا سارا دھیان بکاؤ دکھائی دینے پر ہے۔

سنجیدہ گفتگو اور مکالمے سے گریز بلکہ بیزاری کا یہ عالم ہے کہ میری ہم عمر کیا بلکہ کہیں سینئر خواتین کا یہ حال ہو گیا ہے کہ دانشمندی کے موتی بھی ٹک ٹوک پر ناچ ناچ کر گا گا کر یا میلو ڈرامیٹک ہو کر بکھیر رہی ہیں۔ "یہ عالم شوق کا دیکھا نا جائے۔" مرد حضرات کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ ان کی دادگیری تو مسلم ہے ہی۔ خدارا، اس تجزیئے کو میری ٹیکنالوجی سے

دشمنی نہ سمجھ لیں۔

سوچتی ہوں کہ اگر انسانی زندگی کی ترقی کی طرح انسانی سانحات کی بھی رینکنگ یا رٹینگ ہوتی تو پاکستان میں کن المیوں کو اس فہرست میں جگہ ملتی؟ میری اپنی دانست میں کچھ سمجھوتے اور کچھ بے حسی کو اس فہرست میں جگہ ملنی چاہیے۔ مثال کے طور پر سماجی انصاف اور شہری حقوق کے حوالوں سے بچوں، بچیوں اور خواجہ سرا کمیونٹی اور کئی اقلیتوں کے ساتھ جاری ظلم اور اس پر ریاست کی خاموشی یا نیم دلی سے کیے جانے والے ایکشن جن میں میڈیا پر دھوم مچاتے ہوئے بیانات بھی شامل ہیں۔ یہ سانحہ، المیہ، آفت نہیں تو کیا ہے کوئی ڈارک ناٹک؟۔ کہ ان حساس موضوعات پر اکثر صحافت یا اکٹویسٹس کا لبادہ اوڑھے سنسنی پھیلانے والوں / والیوں کو اجرت، شہرت، شہریت (غیر ملکی) یا مقبولیت مل جاتی ہے مگر مظلوم یا اس کا خاندان انصاف یا تحفظ سے محروم ہی رہتا ہے۔ سیاست اور فارن پالیسی کے عدسے سے دیکھیں تو ملک کا ٹوٹ جانا اور اس کو سانحہ بھی نا سمجھنا اور احساس زیاں کی عدم موجودگی سے بھرپور ایک نصاب اور ایک بھر بھری فارن پالیسی کا ہونا ہے۔

جو قارئین میرے کالم مستقل مزاجی سے پڑھتے ہیں اور سمجھ کر پڑھتے ہیں ان کو "خیر خواہ" سے واقفیت ہو چلی ہے۔ اور وہ ان کے ممکنہ درجات اور کمالات سے سے بھی آشنا ہوتے جارہے ہیں۔ جن کو نہیں پتا وہ یہ سمجھ لیں کہ وہ میرا اسپنسر بورڈ ہیں۔ ان کے مطابق مجھ کو اس عید کے بعد اس تحریر کو سنگین بنانے کے بجائے رنگین رکھنا چاہیے۔

راقمہ کی خیر سے پی ٹی وی کی تربیت ہے۔ قبلہ بدلنے کی پراکٹس ہے۔ ویسے بھی صحافتی

کہاوت ہے کہ کھال بچی گی تو کہانی سنا سکوں گی اور ڈاکٹری کہاوت ہے کہ جان ہے تو جہاں ہے۔ قصّہ مختصر آپ سے گزارش ہے کہ میرے ساتھ مل کر مبارک دیں اس ستارے کو جس کو جھرنا سے شبنم پاکستان نے بنایا مگر وہ اب بنگلا دیشی ہیں تب بھی پاکستان نے امسال ان کی پاکستانی فلم انڈسٹری میں خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو ستارہ امتیاز دیا ہے۔ پاکستان کو فن اور آرٹ کے حوالے سے اکثر تنگ دل ناقدین دقیانوس گردانتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اسی پاکستان میں کئی بنگالی فنکار جیسے مایہ ناز موسیقار آنجہانی رابن گھوش، فلم اسٹار عبدالرحمان مرحوم، گلوکارہ رونا لیلیٰ، فردوسی بیگم اور مرحومہ شہناز بیگم نے مقبولیت حاصل کی اور ہماری محبّت بھی۔ 1971 کے بعد جب گلوکار عالمگیر یا نادرہ بیگم (جن کو منی بیگم کے نام سے پہچان ملی) جب اپنے بنگلہ دیش کے خراب معاشی حالات کی وجہ سے پاکستان آگئے تو پاکستانیوں نے ان کے ٹیلنٹ کی بھرپور پذیرائی کی۔ یہ تو صرف شوبز یا انٹرٹینمنٹ انڈسٹری کے چند نام ہیں۔ میدان سیاست سے بھی کئی نام ھیں جو پاکستان میں باعزت طور پر رہے اور کامیابی حاصل کی۔

دوسری طرف محب وطن پاکستانیوں جن کو عرف عام میں بہاری کہا جاتا ہے، کی بے گور بے کفن لاشوں کو بنگالی بنا کر پیش کرنے والے ہیں۔ پاکستان مخالف پروپگنڈا کرنے والوں کے جھوٹ کو تسلیم کرنے والے کئی پاکستانی چہروں کو حقوق کی پاسداری اور انسانیت کے نام پر بنگلہ دیش نے ایوارڈز دیئے۔ جو بنگالی ملک ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ڈٹے رہے ان کو بھی غدّار قرار دے کر پیرانہ سالی میں سولی پر لٹکایا گیا۔ اور پاکستان خاموش رہا یا کچھ نہ کر سکا یا کچھ خاص قوتوں نے متناسب رد عمل دینے سے روک دیا۔

ریاست کی فہم و فراست میں کیا جانوں؟ صرف کچھ دلوں میں کشادگی کی کمی ہی نہیں بلکہ اور بھی مضمرات ہوں گے کہ پاکستان سے غیر مشروط محبّت کرنے والے بہاریوں کو جن کی نسل کشی بھی ہوئی ان کو بے سائبان چھوڑ دیا گیا؟

پوری دنیا میں بنگلہ دیش پاکستان کو ناکردہ جرائم میں بھی ملوث کرنے میں کوشاں ہیں۔ ان حربوں کی نزاکت کو میں کیا جانوں؟ مجھ کو صرف یہ معلوم ہے کہ لوگوں کی زبانی تاریخ اس تاریخ پر اولیت / فوقیت رکھتی ہے جو درباری لکھتے ہیں چاہے ان کا عہدہ کسی بھی بڑی یونیورسٹی میں پروفیسر کا ہو یا وہ فنڈڈ تھنک ٹینک کے بانی ہوں یا روح رواں یا وہ کسی بھی مملکت کے ٹھیکے دار ہوں۔ شائد پاکستان کے کے نصیب میں دکھ ہے اور خمیر میں محبّت شائد پاکستانوں کی ایک کثیر تعداد جو معصوم ہے اور امن پسند ہے۔ اس کے صدقے اللہ نے اس ملک کو چند لٹیروں اور بدنیت طاقتور افراد کے ہر دور میں اور ہر شعبے میں ہونے کے باوجود کسی صورت قائم رکھا ہوا ہے اور رکھے گا۔ محبّت ایک طاقت ہے مگر اس کو حماقت کا مترادف نہیں ہونا چاہیے۔ مفاہمت ضروری ہے مگر عزت اور عدم مساوات کی قیمت پر نہیں۔ برٹنڈ رسل نے کہا تھا کہ اگر امن و قار کے ساتھ نہیں تو پھر وہ امن نہیں کہلاتا۔ ملکوں کے مابین معاملات اور دو عاشقوں کے درمیان تعلق یکساں نہیں ہوتے۔ امن کا پیغام باہمی احترام پر مبنی ہونا چاہیے۔

سوہنی دھرتی اللہ رکھے۔ قدم قدم آباد تجھے۔

(6)

کراچی 5000 :نوجوانوں کو نہم اور دہم کے امتحان سے دور رکھنے کا اہتمام

https://www.humsub.com.pk/535973/dr-rakhshinda-perveen-6/
06/01/2024

عام طور پر میں انفرادی معاملات پر رد عمل نہیں کرتی اور ورنہ ہی لکھتی ہوں، لیکن 16 دسمبر 2023 کو ایک عظیم محنتی شخص نے میرے ساتھ فون پر رابطہ کیا اور اپنے آپ کو متعارف کرانے کے بعد ایک خوفناک اور المناک صورتحال کا بیان کیا۔ وہ صاحب وطن کی خدمات نہ صرف سرکاری حیثیت میں کر چکے ہیں بلکہ 1971 میں خود اپنے اعلی مرتبت خاندان کے قتل، اور انسانیت کے زیاں کے چشم دید گواہ بھی ہیں اور اب کراچی میں بغیر کسی نسلی تعصب کے پاکستان کی ترقی میں مثبت حصہ ڈال رہے ہیں۔ میں ان کا ذکر اس لئے کر رہی ہوں تا کہ ان کی معلومات کی سچائی کی پختہ سند حاصل ہو سکے۔

ایک شرمناک، بے انصاف اور ظلم کی قصہ کا کچھ یوں ہے کہ تقریباً 5000 بہاری نوجوانوں (لڑکیاں اور لڑکے) جن کو کراچی بورڈ کی کلاس 9 اور 10 کے بورڈ امتحان میں شرکت کرنا چاہیے، ان کو اس کا موقع دینے سے محروم کیا جا رہا ہے کیوں کہ وہ نادرا کے ب فارم کے بغیر ہیں جو بظاہر ایک قانونی شرط ہے امتحان میں شریک ہونے کے لئے۔ یہ حکم مختصراً ان کے والدین کے شناختی کارڈ کی عدم دستیابی کے نام پر ہو رہا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ڈیموگرافی اور سیاست کا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق بدصورت اور گندا، ہو جاتا ہے جب یہ عدل اور برابری کے متبادل ہوتا ہے۔

میرے علم کے مطابق، میں نے کسی بھی طاقتور، آزاد، بہادر، جذبہ رکھنے والے اینکر کو اس مسئلے پر ان کے اچھے تنخواہ والے پرائم ٹائم لائیو ٹی وی شوز یا اس بارے میں ٹویٹ کرتے ہوئے اپنے لاکھوں فالورز کے ساتھ ٹی وی چینلز میں بات چیت کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ مجھے کراچی کی سیاست کے بارے میں علم نہیں ہے، لہذا میں ایم کیو ایم کی سیاست پر رائے دینے سے گریز کرتی ہوں، جو اردو بولنے والوں کی جماعت تصور کی جاتی ہے، یا پیپلز پارٹی کی سیاست پر رائے دینے سے گریز کرتی ہوں، جو عام طور پر ایک لبرل، ترقی پسند اور شمولیت پسند پارٹی مانی جاتی ہے۔

میرے لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ چاہے وہ میڈیا ہو، ایکٹویزم ہو یا سیاست ہو، صرف وہ سچ جو بکتا ہے اور کچھ منافع بخش ہوتا ہے، وہ ہی بولا جاتا ہے لکھا جاتا ہے وہی بیچا بھی جاتا ہے۔

ایک محروم طبقہ، جو ایکٹویزم کے اشرافیہ جیسے جناب جبران ناصر، مسز ایمان مزاری، یا صحافت کے گرو جیسے جناب محمد حنیف، جناب وسعت اللہ، جناب حامد میر، مسز عاصمہ شیرازی، اور دیگر با اثر اور دردمند صحافیوں تک رسائی نہیں رکھتا، یا سسٹم کی اشرافیہ یا طاقت کی علامات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا، اسے کسی کی بھی توجہ نہیں حاصل ہوتی نہ ہی یہ صورت حال ایک تازہ خبر ہے یعنی بریکنگ نیوز نہیں ہے۔ ہاں، ہم بہاری

ہیں، یہ بات خبر کے قابل بھی نہیں اس میں کوئی خبریت بھی نہیں ہے، لیکن ہمارے سب سے قیمتی اثاثے یعنی پاکستان کی تصویر کو داغدار نہ کریں۔

اس معاملے کے پائیدار حل میں مزید تاخیر نہ کریں۔ یاد رکھیں: انصاف میں دیر کرنا، انصاف سے محروم کرنا ہے۔

مخصوص مفادات اور محدود وژن کے نقصانات بہت دورس ہوتے ہیں۔

جو چپ رہی گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا

اب رحم کریں مظلوم بے بس بہاری کمیونٹی کے نوجوانوں کا ساتھ دیں۔

اس کمیونٹی نے ہمیشہ پاکستان سے بے لوث عشق کیا ہے اور عشق کی راہ کی تمام بربادیوں کو بھی حوصلے سے سہا ہے خدارا ان کی نئی نسل کو مکمل طور پر اپنا لیں یہ بچے پاکستانی ہیں اور اپنے بزرگوں کی طرح پاکستان سے بے غرض محبت کرتیں ہیں ان کو تعلیم حاصل کرنے دیں۔

اور انہیں تعلیم جاری رکھنے سے نام نہاد قانون کے نام پر محروم نہ کریں۔

پاکستان کھپے۔

پاکستان زندہ باد۔

---

(7)

ڈھاکہ: جنرل اعظم سے بابر اعظم تک

https://ibcurdu.com/news/153657/
جنوری 25، 2024

یہ ذِکر ہے دھیان سے پڑھنے کا اور سمجھنے کا۔ کئی دہائیوں پہلے 1953 میں کسی نے لاہور کو بچایا۔ بھلا کیسے؟ "احمدیوں" کے خلاف تشدد کو قابو کر کے، جب پاکستان میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا تو وہ نام دوبارہ منظر عام پر آیا۔ منفرد طرز کے محنتی آدمی تھے۔ اپنی دھن میں مگن پوری لگن سے کراچی میں 1958 میں کورنگی پراجیکٹ کے تحت ہزاروں گھر ہندوستان سے پاکستان کی خاطر سب کچھ وار دینے والے "مہاجرین" کے لئے بناڈالے۔

آمر ایوب خان نے ان کو گورنر بنا کر مشرقی پاکستان ٹرانسفر کر دیا۔ دروغ بر گردن راوی ان کی سنیارٹی اور قابلیت سے شائد گھبرا کر۔ پشاور سے دس کلو میٹر کے فاصلے پر "متھرا" ایک گاؤں ہے۔ وہاں جنم لینے والے اور برٹش آرمی سے تربیت یافتہ پاکستان کے یہ پٹھان 'لیفٹننٹ جنرل اعظم خان کے نام سے جانے گئے۔

پاکستان کا (سابقہ) مشرقی حصّہ بنگال جس کے جادو کا ذکر آپ نے اکثر سنا ہو گا یا پڑھا ہو گا، خود جنرل اعظم کے سحر میں آگیا۔ ان کی گورنری کے عہد میں۔ جس کا دورانیہ

(اپریل 1960 تا مئی 1962) مختصر ہے۔ ان فوجی گورنر نے صرف پیار ہی پیار سمیٹا اور حقیقی عزت کمائی۔ انھوں نے اپنے اخلاق، عوامی مزاج، انکساری، عوام دوستی سے بنگالیوں کو، بہاریوں کو، الغرض مشرقی پاکستان میں بسنے والے تمام پاکستانیوں کے دل کو فتح کر لیا تھا۔

وقت نامہرباں گیا تو واپس نہیں آسکتا۔ کبھی نہ لوٹ کر جانے کے لیئے باکمال گورنر کو بھی واپس بلا لیا گیا۔ اور وہ بھی ایک ایسے دور میں جب دشمن پاکستان کو توڑنے کی سازش میں مصروف تھا۔ علیحدگی پسند اور تشدد کی طرف مائل بنگالی نوجوانوں کو بڑی مہارت سے یکجا کیا جا رہا تھا۔ اس سے ان کو واپس مغربی پاکستان بلا لیا گیا۔ جب انھوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور ہمدردی سے ان بنگالی نوجوانوں کو بھی جوائے پاکستان / پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے پر مجبور کر دیا، جو زبان کے مسئلے پر روٹھ چکے تھے اور پاکستان کے مراعات یافتہ طبقات سے نفرت بھی کرتے تھے۔

1971 کا سال قہر برسا کر چلا گیا۔ بھائی بھائی میں پھوٹ پڑ گئی۔ پاکستان کی فوج کا ساتھ دینے والی بہاری کمیونٹی "لبریشن" کے حامی بنگالیوں اور تربیت یافتہ مکتی باہنی کے گروپوں کے ظلم و ستم، بربریت اور سفاکی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ مال، گھر، کاروبار، جان، امان، عزت اور شناخت سب کچھ دیکھتے ہی دیکھتے چھنتا چلا گیا اور انسانیت بھی اپنی بربادیوں پر پھوٹ پھوٹ کر روئی ہو گی۔ کیا کیا قیامتیں برپا ہوئیں مگر کوتاہ اندیش اس نقصان اور اس کے تباہ کن اور شرمناک نتائج سے بے خبر ہی رہے یا بے خبر رہنے میں ہی بہتری جانی۔

مشرقی پاکستان کا خوں ریزی کے بعد علیحدہ ہو جانا یا سقوط ڈھاکہ ہو جانا ایک معمولی حادثہ سمجھ کر بھلا ہی تو دیا گیا۔ کئی جدی پشتی پاکستانی لبرل اور روشن خیالوں نے فوج کو بدنام کر کے یا پاکستان مخالف بنگالی حکمرانوں اور دانشوروں کی ہمدردی حاصل کرنے کی تگ و دو کر کے ایوارڈ اور شہرت حاصل کر لی۔

بہاری جو پاکستان کی محبّت میں پامال ہو گئے، مسلسل تغافل کا سامنا کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ان کا کسی نے نہ سوچا نہ برابر کا پاکستانی جانا اور سب سے نا قابل یقین ستم یہ ہوا کہ تین چار لاکھ بدنصیب غیر بنگالی جن کو بہاری بھی کہا جاتا ہے، پاکستان کی طرف سے آنے والے جہاز کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

52 سال سے زائد عرصہ ہو گیا ان کو پاکستانی شہریت سے بھی بے محروم کیا گیا اور بنگلہ دیش جس کو پاکستان میں تسلیم کر لیا گیا، نے ان کو ان کے گھروں سے بے دخل کر کے بے زمین، بے امان لوگوں کی طرح ایک انسانیات سوز قفس میں رکھا ہوا ہے۔ جس کو کیمپ کہنا بھی بین الاقوامی معیار کے مطابق غلط ہو گا۔ ان پانچ دہائیوں میں بزرگ خاک نشین ہو گئے، نوجوان بزرگ ہو گئے اور بچے بڑے ہو گئے مگر سیاسی اشرافیہ کا تسلط دونوں طرف ہی رہا۔ بے حسی، سخت دلی اور بدلتی ترجیحات نے کسی کو بھی اس بے بس کمیونٹی کی طرف دیکھنے پر مجبور نہیں کیا۔

پاکستان سے ہر طرح کے حکمران بنگلہ دیش کے سرکاری دورے کرتے رہے اور وہ پاکستانی بہاری کم مائیگی میں بھی پاکستان زندہ باد کہتے رہے، واپس آنے کے لیے گڑگڑاتے رہے، مگر کچھ نا بنا۔ کسی نے ان سے مذاکرات نا کیے۔

کوئی فیمنسٹ، ایکٹوسٹ، سول سوسائیٹی کے نمنائندے، یونیورسٹی کے دلیر پروفیسر یا کوئی اور اہلکار ان کے لیے ناتڑپے نابلکے ناہی "کی بورڈ" کے سپاہی بنے۔ سقوط ڈھاکہ پر مکمل سکوت ڈھایا گیا، جو چند آوازیں بہاری کمیونٹی کے لئے ابھری بھی تو ان کی نا شہرت ہے نامقبولیت۔ بنگلہ دیش اور پاکستان اب ایسے دوملک ہیں جن کے آپس کے تعلقات بہت دوستانہ نہیں ہیں، بس نباہ کر رہے ہیں۔

سفارت خانے ہیں مگر ویزے کے مسائل بھی ہیں۔ دوملک ہیں جہاں کی نوجوان نسلوں کو معتبر تاریخ سے بڑی احتیاط سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ جس اردو پر رنجش، دشمنی، قتل وغارت شروع ہوا وہی اردو بنگالی لہجے میں وہ بھی بولتے ہیں کہ طلسم بالی ووڈ ہوشربا سے فرار کس کو ممکن ہے؟

بات چلی تھی جنرل اعظم کی، جنرل اعظم جن کے نام پر لاہور کی اعظم کلاتھ مارکیٹ بھی ہے اور "کھلنا" بنگلہ دیش میں کامرس کالج بھی اس وطن کے دونوں حصّوں سے اتنی محبّت کرتے تھے کہ جب 1975 میں بھٹو نے ان کو بنگلہ دیش میں پاکستان کا سفیر مقرر کرنا چاہا تو سننے میں آیا ہے کہ انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ جنرل صاحب ایک باوقار زندگی پاکستان میں گزار کر 86 سال کی عمر میں 1994 میں لاہور میں مالک حقیقی سے جاملے۔

پرانے لاہور میں اکتوبر 1994 میں ایک ایسے بچے نے جنم لیا، جس نے محدود وسائل کے باوجود کرکٹ کے کھیل میں انتھک محنت کی، ان کو آپ اور ہم بابر اعظم کے نام سے جانتے ہیں اور جو آج کل بنگلہ دیش پریمیم لیگ کے میچز میں اپنی عظمت کی دھاک

پھر بڑھا رہے ہیں۔ دور دور سے ان کے بنگلادیشی مداح ڈھاکہ آ کر ان کی کرکٹ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور آٹو گراف لینے کے لیے بے تاب بھی ہیں۔ وہیں کہیں آس پاس محب وطن پاکستانی جن کو محصورین بھی کہتے ہیں اب تک پاکستان زندہ باد ہی کہتے ہیں اور اپنے آنسو چھپا لیتے ہوں گے۔

سچی محبّت بڑی ظالم ہوتی ہے، ایک بار ہو جائے تو ختم نہیں ہوتی۔ اس بہاری کمیونٹی نے کبھی بھی پاکستان کی توہین نہیں کی نہیں، جھنڈا نہیں جلایا۔ اس کے باوجود کے پاکستان کسی بھی وجہہ سے ان کو اب تک واپس نہیں لا سکا۔

میں نے گھر میں بچپن سے 1958 کے لکشمی پور کے ہیرو میجر طفیل نشان حیدر کا ذکر سنا، پھر میں تمام نشان حیدر کا اعزاز پانے والوں کے بارے میں معلومات جمع کرتی گئی مجھے اب تک دکھ ہے کہ گجرات سے تعلق رکھنے والے ہللی کے ہیرو 1971 کے شہید نشان حیدر میجر اکرم بالدور دناج پور بنگلہ دیش میں اب تک مدفون ہیں۔ پاکستان فارن آفس یا دیگر ادارے شائد کبھی غور کر لیں اور ان کے جسد خاکی کو پاکستان لا سکیں۔ اور آفریں ہے ہمارے فارن آفس یا بے باک میڈیا پر جس نے آج تک یہ نہیں سمجھا کہ ان بے بس لوگوں کا جو کباڑا ہوا ہے اس کا درد نہ بھی ہو تو یہ تو سوچ لیں کہ اس طرح کی بستیاں ملک کے خلاف ایک جیتی جاگتی لائیو جگ ہنسائی ہے۔

(8)

16 دسمبر 1971؛ بنگال سے پاکستان آئی بہاری کمیونٹی کا درد کون سمجھے گا؟

https://urdu.nayadaur.tv/04-Dec-2023/25047
2023،4 Dec

16 دسمبر 1971 کیلنڈر کا ایک دن ہی تو ہے۔ 2023 میں بھی یہ دن آئے گا اور گزر جائے گا۔ شاید چند اخباروں میں پی ایچ ڈی اور ایم فل یا ایم اے کے سٹوڈنٹس کو بحالت مجبوری کوئی کالم یا بلاگ لکھنا ہو تو 1971 کے حوالے سے کوئی اشاعت نظر آجائے گی۔ اس میں بھی زیادہ فوکس بنگلہ دیش کے بنانے والوں پر ہوگا نا کہ قائداعظم کے پاکستان کے ٹوٹنے کا ماتم یا تھوڑا سا بھی افسوس۔ ان کے لیے جو مٹی کی محبّت میں ڈٹ گئے تھے اور برباد ہوئے، ان کے لیے ایک لفظ بھی نہیں۔

اگر میرے جیسوں کا کوئی اظہاریہ ہو بھی، یا تو وہ مین سٹریم میڈیا کے قابل نہیں گردانا جاتا اور اگر چند باضمیر یا دلیر سٹیزن پورٹلز پر تھوڑی سی جگہ مل بھی جائے تو اثرانداز ہونے والے اس کو بخیر و خوبی بلکہ نہایت خوش اسلوبی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پھر کئی اور عوامل بھی ہیں جن کا ذکر تو درکنار، ان سے متعلق سوچنا بھی خوفناک نتائج کا

حامل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اپنی کھال بچانا ہی دانشمندی ہے، خاص طور پر ہمارے جیسے لوگوں کے لیے جن کے طرف دار سخن فہم بھی نہیں۔

انسانی حقوق بشمول نسائی حقوق کی بھی پر فریب سیاست ہے، کس کس کا رونا رویا جائے، کس کس کی دھوکے بازی کو قلمبند کروں اور کن کن بازی گروں پر تبرا کیا جائے؟ کوئی فورم نہیں ہے، نہ سیاسی نہ سماجی، بے شمار فنڈڈ ادبی فیسٹیولز اور تہواروں میں بھی اس المیے پر بات نہیں ہوتی اور یہ خود بھی ایک الگ المیہ ہے۔ پاکستان کی نئی نسل کے لیے 1971 شاید ایک معماہو یا شاید کچھ بھی نہیں۔

فیمینزم میرا اسجیکٹ ہے۔ 30 سال سے زائد عرصہ ہونے کو آرہا ہے میں صنفی امور خاص طور پر صنفی تشدد کے حوالوں سے کام کر رہی ہوں۔ پاکستان کی نامور اور طبقہ اشرافیہ سے کئی فیمینسٹ خواتین اور چند فیمینسٹ مردوں کی سقوط ڈھاکہ (بلکہ ان کے سامنے یہ بول کر دیکھیں اور جوابی فائر کے لیے تیار ہو جائیں وہ صرف لبریشن یا فریڈم یا آزادی بنگلہ دیش جیسی تشریح اور ترکیب کو سننے پر راضی ہیں) پر معنی خیز خاموشی پر بہت جھنجھلائی ہوں، روئی ہوں مگر کوئی ہم نوا نہیں بنا۔ بہت اچھے اور ستھرے ناموں نے بھی اس ایشو پر ساتھ دینے سے کوئی نہ کوئی لاجک تراش کر معذرت کرلی۔

ریپ ہو جانے والی بہاری خواتین اور ان کی چھاتیوں کو کاٹ دینے کی تفصیل یا تذکرہ غیر ملکی اخباروں کے آرکائیوز میں تو مل سکتا ہے مگر پاکستانی عورت کی مظلومیت پر فنڈز لینے والے غیر سرکاری فورمز اور سرکار کی کسی منسٹری میں نہیں ملے گا۔ پاکستان کے

کسی انسانی حقوق، بچوں کے حقوق اور عورتوں کے حقوق والے کمیشنز میں جن کی پولیٹیکل پوسٹنگز سے سب واقف ہیں، ہماری بہاری کمیونٹی کے بچوں، بچیوں، عورتوں، بوڑھوں اور مردوں کے ساتھ ہونے والے دردناک سلوک کا تذکرہ تک نہیں ہوتا۔

صنفی تشدد کے خلاف مزاحمت کے 16 دن میں کئی برسوں سے منا رہی ہوں اور کئی بار کچھ نامور ایکٹیوسٹ خواتین سے منّت تک کی کہ ایک موم بتی میری کمیونٹی کے شہیدوں کے لئے جلا لیں، فاتحہ پڑھ لیں اور بھلا دی جانے والی بہاری خواتین کے ساتھ جو جنسی اور صنفی تشدد ہوا، اس کی بھی مذمت کر لیں، محاسبے کا مطالبہ کریں مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ میں نے جو گہرے گھاؤ کھائے ہیں ان کا واویلا کیا کرنا!

خود مہاجروں کو اور زیادہ تر بہاریوں کو بھی ذلّت کی کربناک زیست سہنے والوں سے کوئی خاص اُنسیت نہیں۔ انڈیا کے مسلمان اپنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ بنگلہ دیش میں نام نہاد کیمپس جو درحقیقت انسانی حقوق کے خلاف ایک لائیو ایف آئی آر ہیں، کے باہر مقیم چند بہاری خاندانوں کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ حکومتوں کے اعتاب کون بھگتے؟ اور زیادہ پریکٹیکل بات یہ ہے کہ کیوں بھگتیں؟ پاکستان کے نام پر اس کی محبّت میں کیوں سولی پر چڑھائے جائیں؟ اور پاکستان کی کیفیات اور احساسات تو طلسم ہوشربا ہیں۔

یہاں کسی کو بھی ہماری اس تکلیف کا ہلکا سا بھی احساس نہیں تو قدر کیا کرنی؟ ہم جیسے کہیں نہیں۔ ہمارا کوٹہ ہے اور نہ ٹھکا۔ ہمارے نام پر مفاد پرست سیاست کرنے والے اور ہم میں سے کچھ جو طبقہ اشرافیہ میں شامل ہونے کے بعد آج تک محب وطن محصور بہاریوں کے حقوق کے لئے ان کی حق تلفیوں کے حوالے سے اور پاکستان میں موجود

اردو بولنے والے غیر پنجابی مہاجروں کے لیے جن کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، کچھ نہیں بولے۔

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

(محسن بھوپالی مرحوم)

یہ اذیت ناک تماشہ جس کو بدیانتی، بے حسی، بے شرمی اور بدنیتی سے بُنا گیا ہے، اسے دیکھتے دیکھتے میری عمر بیت گئی۔ روح تک گھائل ہو گئی۔ جانتی ہوں کہ میرے ان لفظوں سے کوئی متوجہ نہیں ہو گا۔ میری کمیونٹی کی چوتھی یا پانچویں نسل بھی بنگلہ دیش میں پارہ پارہ دل اور ریزہ ریزہ شناخت کے ساتھ گردش رنگ چمن کو خاموشی سے دیکھتی رہے گی۔ بزرگ یہ کہہ کر چلے گئے کہ خدا سے پوچھیں گے۔ نوجوان کبھی کسی ڈونر فنڈڈ این جی او یا فلم پروجیکٹ کے لیے سبجیکٹ یا کی انفورمنٹ بن جاتے ہیں یا استحصالی شرائط کے ساتھ مزدوری کرتے رہیں گے۔

ان بے نوالوگوں کی آواز نہ تو انسانی حقوق کے حامی نامور فیمینسٹس بنیں گے، نہ بے دھڑک صحافی، نہ اداروں سے ٹکرا جانے والے نوجوان خواتین و حضرات، نہ ہی آئیوی لیگ کی جامعات یا بے حساب پولیٹیکل تھنک ٹینک اس بحران اور بربادی کو سمجھنا چاہیں گے۔

یہ مسئلہ کسی مذہب یا مسلک کا بھی نہیں ہے۔ اس سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ کوئی

آرٹسٹ، کوئی لکھاری، کوئی دانشور، کوئی فائر برانڈ ایکٹیوسٹ، کوئی بھی ان کے لیے نہیں ہے۔

میری ہمّت جواب دے چکی ہے، لہٰذا میں سرینڈر کرتی ہوں۔ میں آئندہ اس غیر موزوں موضوع پر بولوں گی، نہ لکھوں گی۔

16 دسمبر 1971 کیلنڈر کی ایک تاریخ ہی تو ہے۔ اس سال 2023 میں بھی 16 دسمبر آکر گزر جائے گی۔

---

(9)

پاکستان آنے والے مہاجرین میں بہاری کمیونٹی کا درجہ دلتوں جیسا ہے

https://urdu.nayadaur.tv/17-Nov-2023/24900
2023،17 Nov

1947 کا ذکر ہے۔ برٹش راج نے ہندوستان میں 300 سال کی غیر رسمی اور 89 سال کی باقاعدہ استحصال پر مبنی حکمرانی کے بعد اپنی سامراجیت ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سال وجود میں آنے والے دو ملک اپنی آزادی کا جشن اگست کے مہینے میں مناتے ہیں۔ بارڈر کے دونوں اطراف ایسے لوگ بھی ہیں جو اس آزادی کو محض بٹوارہ سمجھ کر ناراض اور دکھی ہیں۔ انڈیا اور پاکستان کی مشترکہ محبت منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کو 14 اور 15 اگست ذرا زیادہ یاد دلانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

بہاری کمیونٹی اور دیگر اردو سپیکنگ مہاجرین 1947 کے بعد پاکستان آ گئے، خوشی خوشی یا اس لیے بھی کہ ان کے پاس بلوائیوں کے حملوں کے بعد پاک سرزمین شاد باد کے علاوہ کوئی آپشن ہی نہیں بچا تھا۔

پارٹیشن یا آزادی کے ایک المناک باب میں انسانوں کے قتل عام کو اور "انسانیت کی تدفین کو" ہندو مسلم سکھ فسادات بھی کہا جاتا ہے۔ ہر عقیدے کی عورت کو جنگ کی

وحشت کے اصول کے مطابق ہر طرح سے نشانہ بنایا گیا اور مردانگی کے کئی ثبوت کئی کہانیوں کی صورت میں ناولوں، افسانوں اور فلموں کا حصہ بنے۔ عزت کے مشرقی تصور کے مطابق کئی بہو بیٹیاں جو اپنی جگہ ایک مکمل انسان تھیں، اندھیرے کنوؤں اور ان گنت ان سے بھی زیادہ گہری خوف ناک خاموشیوں کا حصہ بن گئیں۔

جن مہاجرین نے مغربی پاکستان کا رخ کیا اور جن کو سابقہ مشرقی پاکستان جانا پڑا، ان کی کہانیوں میں اور ان کی آپ بیتیوں میں کافی فرق ہے لیکن میرے خیال میں ہجر کا دکھ دونوں کو ہی لاحق ہوا اور اس کا نام ہجرت پڑ گیا۔

آج میں 1971 کی زیادہ بات جان بوجھ کر نہیں کر رہی بلکہ ایک پاکستانی (جس کی اولین یادداشت ہی شہر اقتدار کی ہے جسے میرے جیسے کئی لاپروا ایکٹیوسٹ کوفہ بھی کہتے ہیں) کی حیثیت سے کچھ بے ترتیب یادیں بلکہ کچھ آوازیں جو اب بھی میرے دل میں گونجتی ہیں، قلمبند کر رہی ہوں۔

ایک آواز، تمسخر سے بھرپور، اس بڑھیا کا مذاق اڑاتے ہوئے آتی ہے؛ تو آپ کے پودینے کے باغ تھے؟ ہاہاہا۔۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ایسی آوازیں میرے ساتھ اب بھی ہیں اور جن کی ہیں وہ پاکستان کے دانشور ہیں، مایہ ناز صحافی وغیرہ ہیں۔

وہ بوڑھی خاتون میری نانی کے گھر آتی تھیں اور یہی بتایا کرتی تھیں کہ وہ پاکستان جہاز میں آئی تھیں۔ ان کو ہم لوگ دہلی والی آنٹی کہتے تھے۔ چند سالوں کے بعد وہ پودینے والی بڑھیا کہلانے لگیں، پھر وقت کی گرد میں کہیں کھو گئیں۔

کچھ اور آوازیں بھی ہیں جن کی وجہ سے مجھے بہت بچپن ہی میں پتہ چل گیا تھا کہ بہاریوں کو اردو سپیکنگ کمیونٹی میں بھی یوپی، سی پی وغیرہ والوں کی طرف سے امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا اور اب بھی کرنا پڑتا ہے۔ میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان سے موجودہ پاکستان میں 'مہاجرین' میں بہاری کمیونٹی کو دلت کا درجہ حاصل ہے۔ بہت رنج ہے۔ بہت دکھ ہے۔ بہت گرہیں ہیں، مگر کوئی سننے والا نہیں۔

جو امیگریشن حاصل کر کے یہاں سے چلے گئے امریکہ، کینیڈا وغیرہ، انہوں نے اچھا کیا۔ بدیس میں اگر مشکل ہوتی ہے تو مسلمان ہونے کی وجہ سے۔ بہاری، اردو سپیکنگ، مکڑ، بھکاری، مہاجر؛ یہ ہم لوگوں کو 'پیار' سے بلانے کے کئی القابات میں سے چند ایک ہیں، ہونے کی بدولت نہیں۔

1971 کا ذکر نہیں ہے۔

1971 آیا اور گزر گیا۔ میرے مرحوم والد صاحب نے 16 دسمبر 1971 کے حوالے سے یہ شعر لکھا تھا؛

وہ قیامت جو سر سے گزری ہے
دیکھیے کب شعور سے گزرے

(پروفیسر نظیر صدیقی مرحوم)

کیونکہ ابھی پاکستان کو شعور کی الف بے کا بھی نہیں معلوم، اس لیے کم از کم اس تحریر کی حد تک میں بہاری گمشدہ، بہاری فراموش کیے جانے والے 3 سے 4 لاکھ محب وطن

پاکستانیوں کی بات نہیں کروں گی جن کی آنکھیں پاکستان کی طرف دیکھتے دیکھتے پتھرا چکی ہیں اور ان کی نئی نسلیں شناخت کی پیچیدہ گردشوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔

2023 کا ذکر ہے۔ زندگی کی فلم کو فاسٹ فارورڈ کر کے 2023 میں آجاتے ہیں۔ دنیا سکتے میں ہے۔ بے بسی میں ہے۔ دنیا چلانے والے غصے میں فرعونیت کا اظہار بلا جھجک کر رہے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے والے یا ان کے شر سے ڈرنے والے بڑے بڑے عہدوں اور ایوارڈز کے ساتھ خاموش ہیں۔

دنیا میں رائج بے حسی اور ناانصافی کے ضابطوں پر کروڑوں بے طاقت لوگ چلّا رہے ہیں۔ ان کو آپ انسانیت کا ضمیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ کچھ جنونی ہیں۔ ان کو انسانیت کے عشاق سمجھنا چاہئیے۔ وہ سوشل میڈیا اور سڑکوں پر مزاحمت کر رہے ہیں۔

مجھ جیسے بے حیثیت مگر حساس لوگ (اف کتنا خفت بھرا اور خوف ناک جوڑ ہے) دم سادھے ٹی وی پر غزہ میں جاری نسل کشی لائیو دیکھ رہے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ پاکستان میں یہ بحث ہو رہی ہے کہ افغان مہاجرین کو افغانستان واپس کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ چار دہائیوں سے زائد عرصے تک پاکستان نے افغان مہاجرین کی بین الاقوامی امداد کے سہارے مہمان نوازی کی اور پھر اچانک یہ فیصلہ نہ جانے کہاں، کیسے اور کیوں ہوا کہ جن افغان مہاجرین کے پاس پاکستان میں مقیم رہنے کا باقاعدہ اجازت نامہ نہیں ہے ان کو بے دخل کیا جائے۔ لیکن بظاہر جائز اور معقول دکھنے والی بات نے تاریخ اور سیاست کے کئی گریبانوں کو چاک کیا ہے۔

افغان لوگوں کی، بوڑھے، کمزور، غریب، معصوم بچوں، پریشان حال مفلس عورتوں اور بچیوں کی نگاہوں میں دکھ اور دربدری کی تذلیل سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئی۔ پھر زمین کی محبت، قبیلے کی محبت میں ڈوبے نوحے اور ماتم گر سب ہی سوشل میڈیا کا حصہ بننے لگے۔

انسانیت اور ہم دلی کے حوالے سے بھی بات ہو رہی ہے۔

ہمارے ہجر اور افغان لوگوں کی ہجرت میں فرق ہے۔ ہم اپنے نئے وطن پاکستان آئے بٹوارے کے بعد، آزادی کے بعد، جہاں کوئی اپنا نہیں تھا، نہ ہے بلکہ ہمارا تو مذاق اڑایا گیا، توہین کی گئی۔ برابری کی بنیاد پر شراکت داری کے تصور کو بھی ان کی دھرتی پر حملہ جانا گیا۔ کچھ قصور ناجائز کلیم کرنے والوں کا بھی ہے۔ نتیجے کے طور پر سب ہی بھوکے ننگے پناہ گزین قرار دیے گئے۔

جبکہ افغان لوگ جنگ کی وجہ سے پاکستان آئے۔ ان کی آپسی رشتے داریاں ہیں۔ قبائل ایک ہیں۔ دری، پشتو زبانیں ان کو ہم آہنگ کرتی ہیں اس سماج سے۔ پھر ان کے لیے اقوام متحدہ کی سپورٹ بھی ہے اور سیاسی چالوں میں ایک مقام ہے۔ ہمارا اور ان کا مقابلہ ہے اور نہ ہی موازنہ بنتا ہے۔ ویسے بھی دکھ درد اور دربدری کا مقابلہ یا موازنہ کرنا کم ظرفی ہے۔

جس تن لاگے، وہ تن جانے۔

ہم اردو بولنے والے 'مہاجرین' کو اور خاص طور پر بہاری لوگوں کو جو پاکستان میں مقیم

ہیں، اس مشکل وقت میں نہ تو عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا چاہئیے اور نہ ہی کسی کے بہکاوے میں آکر ایسی بات کرنی چاہئیے جس سے کسی بھی لسانی گروپ یا کمیونٹی کی دل آزاری ہونے کا امکان ہو۔ یاد رکھیں نفرت کی آگ کی لپیٹ میں آنا بہت آسان ہے، اپنے غم اور نقصان کو بھول کر محبت کی آنکھ سے دوسروں کو دیکھنا اور سمجھنا انتہائی مشکل ہے، لیکن ہمارے پاس یہی ایک راستہ ہے۔ ہم نے پاکستان سے غیر مشروط محبت کی ہے اور بے زمینی، بے وطنی کے تہہ دار المیوں کو ہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔

دو غلطیوں سے ایک صحیح نہیں بنتا۔ ہمیں تحمل، انسانیت اور انصاف کے پیمانوں پر اپنا بیانیہ تشکیل دینا چاہئیے۔ ہمیں ان چالاک، عیار، ایلیٹ اردو سپیکنگ لوگوں سے بھی فاصلہ رکھنا ہے جن کا کام صرف چڑھتے سورج کی پوجا کرنا ہے اور جن لوگوں نے آج تک ہمارے لیے آواز تک نہیں اٹھائی۔ ان کے فریب میں آنے کا مطلب صرف اپنی مشکلات میں اضافہ کرنا ہے۔ ہم دہشت گردی کو رد کرتے ہیں اور اختلافی رائے رکھنے کے باوجود دشمنی میں بھی اعلیٰ ظرفی اور انسانیت کے قائل ہیں۔

دل زیادہ گھبر اجائے تو بہاری پروین شاکر کا یہ شعر پڑھ لیں:

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

---

(10)

پاکستانی بہاری: بربادی کی ایک غمناک داستان

https://ibcurdu.com/news/155167/

6اپریل، 2024

حامد میر صاحب نے اپنے معروف شو پر بریک پر جانے سے پہلے جلدی جلدی کسی امدادی تنظیم کی طرف سے بنگلہ دیش میں محصور "پاکستانی" بہاریوں کے لیے ایک اپیل پڑھ کر سنائی۔ بہت برسوں کے بعد آنسوؤں سے رو پڑی۔ نجانے ٹھیس کہاں لگی تھی اور اشکوں کی جھڑی کیوں لگی؟

خیال آیا کہ برق رفتاری سے ادا کی گئی اس اپیل پر کوئی رد عمل بھی ہوا ہو گا؟ سنی ان سنی ہو گی یا کسی نے پل دو پل سوچا کہ یہ کن مصیبت کے ماروں کا ذکر کیا گیا؟ یہ کونسی کمیونٹی ہے؟ یہ بنگلہ دیش کے کن شہروں میں کیمپس نما قفس میں مقید ہیں؟ یہ وہی تین چار لاکھ ہیں جن کے بزرگ پاکستان کی محبّت میں ہجرت در ہجرت کرتے رہے، برباد ہوتے رہے اور 1971 کے قہر آلود سال میں بے سروسامان ہو کر اپنے گھر سے دربدر ہوئے۔

انھوں نے سولہ دسمبر اپنی بد نصیب آنکھوں سے دیکھا، اپنے نوجوانوں کو بچوں کو بچیوں کو بیدردی سے مکتی باہنی کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا، اپنے گھر کو جلتے لٹتے دیکھا اپنی شناخت کو بدلتے بگڑتے دیکھا۔ ان کی آنکھیں پاکستان سے آنے والے جہازوں

کے انتظار میں پتھرا گئیں اور کوئی نہیں آیا۔ ان کو بھکاری کہا گیا۔ قوم پرستوں نے نفرت اور تضحیک کا نشانہ بنایا۔ نام نہاد قومی سیاسی جماعتوں نے نظر انداز کیا حتیٰ کہ "مہاجروں" کے نام پر بننے والی جماعت نے بھی محصورین کو بھلا ہی دیا اور پاکستان میں بسنے والے بہاریوں اور دیگر اردو اسپیکرز جو سابقہ مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے کراچی اور پاکستان کے دیگر حصّوں میں آباد ہوئے ان کی عزت تکریم برابری کے لیے کچھ نہ کیا۔

روتے روتے اپنے ماموں اور ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر جاوید محسن ملک کو فون کیا اور ان سے پوچھا کہ ہم لوگ کون ہیں؟ نانا کے کومیلا والے گھر کا پتا کیا تھا؟ میرے ابو جان کے ڈھاکہ والے گھر کا پتا کیا تھا؟ کاش فارن آفس نے ہم بہاریوں کی پراپرٹی کے حوالے سے کچھ سوالات کبھی کئیے ہوتے؟ سنا ہے کہ فاطمی صاحب بھی بہار کے ہیں لیکن دروغ بر گردن راوی انہوں نے آج تک بہاری کمیونٹی کے حقوق کے لئیے کوئی بات نہیں کی؟ کاش دانش وروں نے بھی کچھ پوچھا ہوتا؟ یہاں تو سکوت ہے۔ سناٹا ٹوٹتا ہے تو صرف زہر میں بجھے الفاظ اور جملے سنائی دیتے ہیں۔

میں نے اسلام آباد میں پروان چڑھ کر بہت توہین سہی، اسکول کالج میں بللینگ برداشت کی، بہت ساری "دوستیں" ایسی بھی ہیں جو انسانی اور خواتین کے حقوق کی چیمپئنز ہیں مگر ان سے بہاری کمیونٹی کی بات کرنے کی "جرات" کر کے دیکھ لیں اور آپ کو اندازہ ہو گا کہ تنگدلی، تعصب، نفرت اور بددیانتی کتنی خوبصورت شکلوں میں

بھی دستیاب ہیں۔ وطن میں جلاوطنی کا احساس بھی عجب ہے۔ میں نے ایک نظم بھی اس حوالے سے لکھی تھی، جو میری کتاب "مجھے محبّت سے ڈر لگتا ہے" جو 1996 میں شائع ہوئی تھی اس میں شامل ہے۔

سمجھ نہیں آتا میری بدنصیب کمیونٹی کا مقدّمہ کون لڑے گا؟ ایک ایسے وقت میں جب غزہ میں جاری نسل کشی ٹی وی پر لائیو نشر ہونے کے باوجود عالمی ضمیر ساکت ہے یا ان طاقتوں کا ضمیر ساکن ہے جو اس المیے کو روک سکتے تھے یا اب بھی روک سکتے ہیں۔ ہمارے پاس تو کوئی ساؤتھ افریقہ بھی نہیں۔ جو بہاری بنگلہ دیش میں کیمپس کے باہر بنگالیوں کے ساتھ شادی کے بندھن میں ہیں، ان کی زبان بندی بھی برحق ہے۔ ان کو پورا حق ہے کہ اپنے بچوں کو محفوظ اور پرسکون رکھیں اور ایک المنک باب کو بھول جائیں۔ ہندوستانی مسلمان اپنی سزا بھگت رہے ہیں۔ جو پاکستان میں ہیں وہ اپنی زندگی کی بھول بھلیوں میں گم ہیں۔ جو یہاں سے مغربی ممالک ایمیگریٹ کر گئے جس کو وہ ہجرت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں، ان کی بھی اپنی مجبوریاں ہیں۔ ان میں سے چند ایک جو کسی این جی او یا صحافتی منصب کی وجہ سے اس ایشو سے جڑے ہیں، وہ ایک نپے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔

کسی حد تک کھل کر بہاریوں کا کیس لڑتے ہوئے بہت کم ہی بہاریوں کو دیکھا۔ قابل ستائش مثالوں میں شبانہ آپی کی بہادری کو سلام کہ اب بنگلادیشی ہونے کے باوجود ڈھکے چھپے انداز میں ہی سہی پاکستان سے محبّت کرتی ہیں اور بہاری کمیونٹی کا درد سمجھتی ہیں۔

اسی طرح امریکا میں مقیم محترم احتشام نظامی ہیں یا کینیڈا کی محترمہ شاہین کمال ہیں جو ظلم ہم نے سہے وہ بتاتے ہیں۔ ان کی طرح کراچی کی ماہر تعلیم اور ادیبہ ہماری بہاری کمیونٹی کی محترمہ شہناز پروین ہیں اور اسلام آباد سے محترمہ فرحت پروین ہیں جنہوں نے سقوط ڈھاکہ اور دربدری پر ناول اور کتابیں لکھ دیں۔ عظمت اشرف صاحب جو اب ٹورنٹو میں ہیں انھوں نے انگریزی کتاب ریفیوجی قلم بند کی جس کا اردو اور بنگلہ ترجمہ بھی ہوا۔

کئی اور بہاری افسانہ نگاروں اور شاعروں نے بھی ہماری بے قدری اور بے بسی کو رقم کیا۔ یہ نہیں پتا کہ ہماری نئی نسل نے اس تمام قصّے میں کتنی دلچسپی لی یا ہم نے ان کو اس طرف مائل کرنے کی کوشش بھی کی؟ ہم قلم کے ساتھ کتنے ایماندار رہے؟ راگ یہی آلاپتے رہے کہ ایک ہزار میل دور تھا مشرقی حصّہ، بنگالی مختلف تھے اور ایسا ہونا ہی تھا یا کسی نے ہمّت کر کے سوال بھی کیا کہ کیا ہمارا قتل ہماری نسل کشی جس کو چھپایا گیا ہماری خواتین کی بے حرمتی جس کو بتایا نہیں گیا۔ ہماری شناخت کا مسخ ہونا جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ ان دکھوں کو کسی نے جانا، مانا، سمجھا، جانچا؟ شائد نہیں؟

جب کھل کر بات ہو گی۔ مکالمہ ہو گا — یاداشت درست کی جائے گی تو صرف بنگالیوں کے ساتھ کی گئی ناانصافی نہیں بلکہ اور بہت کچھ بھی منکشف ہو گا۔ یہ کہاں کا انصاف تھا کہ پاکستانی اشرافیہ کی بے حسی اور ان سے ناراضگی کا غصہ نہتے اور معصوم لوگوں سے لیا گیا؟ شائد میری پاکستانی قوم ان بے گناہ فوجیوں اور ان کی فملیز کے بہیمانہ قتل پر بھی گریہ کر لے جو ایسٹ پاکستان رائفلز میں بنگالی فوجیوں کی غدّاری کی نذر ہوئے۔ بے کفن رہے۔

ہم سب کو بنگالیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے بہاریوں کی بربادی کو نہیں بھولنا چاہیے۔ زخم تب مندمل ہوں گے جب زخم کے ہونے کو تسلیم کیا جائے اور درد کا درماں ڈھونڈا جائے۔ مقتدر اداروں اور افراد کو اس سمت کی طرف توجہ دینی ہوگی اور ہماری نمائندہ آوازوں کو۔۔ مخلص لوگوں کو۔۔ مینسٹریم اور سوشل میڈیا میں وقت دینا ہوگا۔ نا صرف پاکستان بلکہ بنگلہ دیش اور انڈیا کی کامیابی بھی ایک دوسرے کا مذاق اڑانے یا نیچا دکھانے میں نہیں ہے بلکہ حوصلے اور بردباری کے ساتھ تاریخ کو پرکھنے میں ہے اور اس سے سیکھنے میں ہے۔

بہاری کباب کھاتے ہوئے اور بہاری پاکستانی عالمی شہرت یافتہ شاعرہ پروین شاکر کی شہرہ آفاق غزلوں کو سنتے ہوئے سراہتے۔ ہوئے تھوڑی سی کشادگی محب وطن پاکستانی بہاریوں کے لیے بھی پیدا کر لیں۔ ان کو خیرات کی نہیں محبّت، عزت اور پاکستان کے لئے دی گی قربانیوں کے اعتراف کی ضرورت ہے۔

آپ سب کو رمضان کی رحمتیں مبارک اور عید کی پیشگی مبارک۔

رہے نام اللہ کا۔

(11)

المیہ پاکستان: میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں؟

https://ibcurdu.com/news/156226/

جون 4، 2024

ننگے، بھوکے، منافق، مفاد پرست، متعصب، مکار، "مکڑ" اور نجانے کن کن "پیار" کے ناموں سے بہت سے "مقامی پاکستانی" جو ہجرت کے صدمات اور بے دری کی تلخیوں سے کبھی آشنا نہیں رہے، کئی بے حیثیت لوگوں کو جو پاکستان سے غیر مشروط محبت کرتے ہیں 'جانتے اور پکارتے ہیں۔

میں خود آج تک توہین اور تذلیل کی مختلف اشکال سے نبرد آزما رہتی ہوں۔ لیکن ان سب کے باوجود میں پاکستان کے ہر خطے اور ہر لہجے سے محبّت ختم نہیں کر سکتی۔ لوگ بنیادی طور پر پیارے ہوتے ہیں مگر وہ کسی "طلسم" کا شکار ہو کر کسی کے لئے ناقابل برداشت اور ظالم بن جاتے ہیں۔

میں نے ہمیشہ امن، صلح، سچ کو مان کر اور زخموں کو سینے کی بات کی ہے اور میری زندگی اس بات کی گواہ ہے۔ مجھے "سابقہ مشرقی پاکستان" کے بنگالیوں کے ساتھ سابقہ "ویسٹ پاکستان" کے اشرافیہ کی گئی ناانصافیوں کا پورا ادراک ہے۔

پسے ہوئے جن بنگالیوں کو عوامی لیگ نے متاثر کیا اور جو مکتی باہنی بن گئے وہ ٹیچر، آرٹسٹ، سٹوڈنٹ، ملا ہونے کے باوجود انسانیت کے شرف سے گر گئے اور سارا غصہ نہتے پاکستانی بہاریوں پر اور فوجیوں کی فیملیز پر نکال دیا۔ پنگھوڑے کیا ماؤں کے پیٹ میں بچوں کو بھی نا چھوڑا۔ ان کی بغاوت کامیاب ہوئی اور آزادی کی تحریک کے نام سے ان کی نئی نسل کو پڑھائی گئی۔

میں نے ضبط کے کمال کو بارہا آزمایا ہے۔ ایک بار امریکا میں ایک فیلو شپ کے دوران ایک ایسے بنگالی گھرانے کو میرا ہوسٹ بنایا گیا جن کے سربراہ کا کمیونٹی میں بہت نام اور مقام تھا اور ان کی وجہ شہرت "فریڈم فائٹر" تھی یعنی وہ سابقہ مکتی باہنی تھے جنھوں نے کئی بہاریوں کو جو پاکستان کی فوج کے ہمدرد تھے اور ملک کو ٹوٹنے سے بچانا چاہتے تھے اور اس کا ساتھ دیا تھا، اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ ستم یہاں پر ختم نہیں ہوا بلکہ میرے ساتھ جو پاکستانی تھے اور کچھ تو اقتدار میں بھی ہیں، ان سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا اور میں ہی گروپ سے علیحدہ سی رہی۔ میں نے اس مشکل اور کربناک وقت کو ہمدلی اور صبر کے ٹولز کے ساتھ اللہ کی مدد سے نپٹایا۔ بات میری ذات کی نہیں ہے بات ہے، پاکستان کی جس کی اہمیت یا قدر کو صرف وہ لوگ ہی جان سکتے ہیں جن کا سب کچھ پاکستان ہے اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ پاکستان میں ہی ہے۔

حمود الرحمٰن کون تھے ؟

آج کل ایک کمیشن کی رپورٹ کا ایک خاص پولیٹیکل تناظر اور بیانیے کی بابت چرچا ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ حمود الرحمٰن کون تھے؟ حمود الرحمٰن یکم نومبر 1910 کو پٹنہ، بہار، برٹش انڈیا میں پیدا ہوئے۔ بہار میں پیدا ہونے کے باوجود، رحمٰن بنگالی مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا خاندان تقسیم ہند سے پہلے وکالت کے پیشے سے منسلک تھا۔ ان کے بھائی، معمود الرحمٰن بھی ایک بیرسٹر تھے جو کلکتہ ہائی کورٹ کے جج بنے۔ ان کے والد، خان بہادر ڈاکٹر داؤد الرحمٰن غیر منقسم ہندوستان میں پہلے مسلمان سول سرجن تھے جنہوں نے رائل کالج لندن سے ایف آر سی ایس کیا۔ حمود الرحمٰن، "بنگلہ دیش کی آزادی کی جنگ" اور 1971 کی بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران پاکستان کے وفادار رہے۔ انہوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کی حمایت نہیں کی اور ان واقعات کے دوران خاموش رہے۔ انہوں نے 1971 میں سپریم کورٹ کی عمارت میں ذوالفقار علی بھٹو کو صدر پاکستان کے عہدے کا حلف دلایا۔

ان کا تعارف اس لیے ضروری ہے کہ میڈیا میں سورس کی بہت اہمیت ہے۔ اگر معلومات کی فراہمی ایک ایسے سورس سے ہے جس کا اعتبار نہیں تو کہانی ختم۔ یہ فیصلہ آپ کا ہے کہ ان صاحب کے بارے میں یہ تفصیلات جان کر آپ ان کی رپورٹ کو کس حد تک قابل اعتبار جانیں گے؟ اس وقت پاکستان میں اس رپورٹ کے نام پر بہت ہی

عجیب سا ماحول بنایا جا رہا ہے۔ بہت ہی ہڑبونگ ہے، حیرانی ہے، ہراسگی ہے، الزام تراشی ہے، دشنام اندازی ہے اور پائنٹ سکورنگ ہے۔ نہیں ہے تو سنجیدگی، اخلاص، سچ کو دیکھنے اور پرکھنے کی جرات، تاریخ کو ملیامیٹ یا توڑ مڑوڑ کرنے کے بجائے اس سے سیکھنے کی اہلیت اور ہمّت، معاف کر دینے کا اور معافی مانگنے کا حوصلہ۔

میں نا تو وار اسٹریٹجسٹ ہوں، نا ہی ڈیفنس انالسٹ، نا ہی پرومپٹر سے سانس لیے بغیر سکرپٹ پڑھنے والی کرنٹ افیئرز کی کوئی اینکر (شکر ہے اپنے دور میں جب بھی بولا، جو بھی بولا اپنے ذہن سے سوچ کر روانی سے درست تلفظ کے ساتھ ادا کیا) نا ہی آگ لگا دینے والی وی لوگر یا بڑے اخبار کی کولمنسٹ یا رٹائرڈ سول سرونٹ جو، اب دانشور کی کیٹیگری میں شامل ہیں نا ہی کوئی ٹھسسے دار بیگم۔ میں ایک کنواں کھود کر پانی پینے والی اور ایماندارانہ زندگی گزارنے والی پاکستانی ہوں اور بہارن بھی ہوں۔

میرا یہ کالم نا تو کسی اور کسے کے موقف کی حمایت ہے نا ہی مخالفت بلکہ ایک کوشس ہے کہ کوئی خاص طور پر سوشل میڈیا سے علم، شعور، حکمت اور دانائی کے موتی چننے والی نوجوان نسل تحقیق کی طرف بھی راغب ہو اور یہ جانے کے کس طرح ٹیکسٹ کو سمجھتے ہیں اس کی توضیع کیا ہو۔ یہ ایک مشق ہے اور اس کے لیئے لکھنا پڑھنا ضروری ہے۔

سب کے پاس ہی وقت کم ہے اور ایک ریس لگی ہوئی ہے۔ ملک ٹوٹنے پر ہر طرح کا رد عمل اچانک 53 سالوں کے بعد ہو رہا ہے۔ ہر ایک کے پول کھل رہے ہیں۔ جس کا جس

طرف جھکاؤ ہے ان کو کئی نام کھل رہے ہیں۔ بنگالیوں سے بھی بہت محبّت کا اظہار ہو رہا ہے، جو اچھی بات ہے۔ نفرت اور دشمنی تو نظریاتی مخالفین سے بھی نہیں کرنی چاہیئے۔

نہیں تذکرہ ہے تو میری بد قسمت کمیونٹی کا کہ اس نے فوج کا ساتھ دیا اور فیشن چل رہا ہے فوج کے خلاف بات کر کے فوراً فوراً اول درجے کے صحافی، اکٹیوسٹ اور فکری لیڈر بننے کا۔ میری کمیونٹی کی نسل کشی ہوئی، میری کمیونٹی کی خواتین کی زندگی پامال ہوئی، مشرقی بنگال کے ندی نالے میری کمیونٹی کے لاشوں سے بھر گئے تھے مگر ہمارا کوئی نوحہ خوان نہیں کوئی ماتم کناں نہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ خود اردو سپیکنگ کمیونٹی بشمول بہاری کمیونٹی کے وہ لوگ جو طاقت ور پوزیشنز پر ہیں وہ یا تو اپنی شناخت چھپاتے ہیں یا اپنے آپ کو اس معاملے سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ محصورین تو بھولی بسری یاد ہیں یا این جی اوز کا پبلسٹی سٹنٹ۔ بہت سی بہاری فیملیز کے بظاہر تعلیم یافتہ اور تاریخ سے واقف جو بنگلہ دیش کے "کیمپس" میں نہیں ہیں اور بنگالیوں کے ساتھ شادی کے ناطے رشتے داری میں ہیں، وہ بھی مجبوری میں یا ناواقفیت کی بنیاد پر سوشل میڈیا پر غیر ذمہ دارانہ باتیں پھیلاتے ہیں اور پاکستان کی تضحیک کرنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے۔

کاش ہمارے پاس سنجیدہ فارن آفس ہوتا اور پاکستان کے حق میں فضا بنی ہوتی، ساتھ ہی ساتھ ملک میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا سنجیدہ جائزہ لیا جاتا۔

رہی بات پاکستان کس نے توڑا تو اس کے لیئے کوئی دس منٹ کا وقت نکالیں اور تحمل کے

ساتھ ایک انگریزی کالم پڑھ لیں جو اردشیر کاؤس جی (13 اپریل 1926–24 نومبر 2012) نے 17 ستمبر 2000 میں ڈان میں لکھا تھا اور ان کے مطابق 1971 کے آخر میں جناح کے پاکستان کے نصف کے نقصان کے ذمہ دار تین افراد تھے۔ سب سے پہلے، یحییٰ خان، جو ریاست کے سربراہ، حکومت کے سربراہ، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، مسلح افواج کے سپریم کمانڈر تھے، جو اپنے جانشین ذوالفقار علی بھٹو کے ذریعے قید میں رکھے گئے، ایک کھلے مقدمے سے انکار کیا گیا، آمر جنرل صدر ضیاء الحق کے ذریعے آزاد ہوئے، اور ایک بیمار اور تنہا آدمی کے طور پر مر گئے۔ دوسرے، ذوالفقار علی بھٹو، جنہوں نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی تیاری کا حکم دیا اور پھر اسے دبا دیا، اور ضیاء الحق کے ذریعے معزول ہوئے، ان پر مقدمہ چلایا گیا، اور پھانسی دی گئی۔ تیسرے، مجیب الرحمٰن، بنگلہ دیش کے پہلے وزیر اعظم جنہیں ان کی اپنی فوج کے کچھ باغی فوجیوں نے قتل کر دیا۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں

تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

(12)

پاکستان زندہ باد سے بیجوئے شو بھو جاتر اتک

https://www.humsub.com.pk/491470/dr-rakhshinda-perveen-2/
26/12/2022

ایک ایسی بدنصیب کمیونٹی (جس کے پرکھوں نے پاکستان کی خاطر تین ہجرتیں کی ہوں) کے بارے میں واضح اور درست معلومات تو موجودہ پاکستان کے بیشتر عوام جو نا انصافی 'نا اہل اور بدحواس گورننس سے جڑے مسائل اور مصائب کا شکار رہتے ہیں، کے پاس کیا ہوں گی جب کہ سچی 'سنجیدہ اور صحیح خبروں' اطلاعات اور معلومات کا فقدان، اگر قحط نا بھی ہو تو اب ہمارے زیادہ تر ذرائع ابلاغ اور اکادمیہ کے پاس بھی عام ہے۔ اس سے بھی زیادہ خوفناک اور دردناک (شرمناک ارادتاً نہیں لکھا) حقیقت یہ ہے کہ اس کمی کا اول تو کوئی ادراک ہے ہی نہیں اور اگر کہیں کوئی آگاہ ہے تو کوئی خاص رنج و غم بھی نہیں۔ یعنی احساس زیاں بھی نہیں۔ جن حرماں نصیبوں کا آغاز میں ذکر ہوا ان کو اکثر بہاری کہا جاتا ہے ان کے تمسخر سے بلانے کے کئی اور نام بھی ہیں۔

میرا موضوع وہ پاکستانی بہاری ہیں جو پاکستان سے غیر مشروط محبت کرنے کے جرم میں 51 سالوں سے بنگلہ دیش کے کیمپوں میں محصور ہیں۔ ان کے حالات اور ہمارے تعصبات پر میں کئی سالوں سے دہائی دے رہی ہوں۔ کبھی انگریزی اخباروں میں لکھ کر 'کبھی ڈیجیٹل فورمز پر بات کہہ کر' کبھی ایڈوو کسی مکالمے کروا کر۔ مگر نتیجہ ڈھاک کے

تین پات۔ کیسی معافی کہاں کا کفارہ؟ کئی مواقع پر تو کھل کر مخاصمت سامنے آئی

خیر مجھ کو اپنی نان فنڈڈ کاوشوں کے کامیاب ہونے کی کوئی خاص امید بھی نہ تھی۔ بس اپنے حصے کا دیا جلانے کی لگن رہی۔ بے گھری، بے بسی اور بے وطنی کی اس دلخراش داستان سے نہ ہماری سول سوسائٹی اور نہ ہی میڈیا کو دلچسپی ہے۔ چند بلند آوازیں جیسے ڈاکٹر اقبال احمد، منظور احمد، جمیل الدین عالی یا محمد ضیاء الدین آسودہ خاک ہو چکی ہیں۔

دل چاہتا تھا کہ کاش اس سال 16 دسمبر کو انتظار کے 18628 دنوں کا خاتمہ ہو یہ محب وطن اپنے پاکستان کو لوٹ سکیں۔ دل چاہتا تھا کہ کوئی بڑا ادارہ نظریاتی بھی اور نشریاتی بھی، کوئی بڑا شاعر ’ادیب‘ استاد ’کالم نویس‘ انسانی حقوق بشمول عورتوں کے حقوق کا کارکن / رہنما ان پاکستانی بہاریوں کی آواز بنے ’ان کو ان کے وطن پاکستان واپس لانے کی بات کرے مگر اتنا گہرا اور بوجھل سناٹا! میں اردو اور انگریزی میں 1971 سے متعلق پاکستانیوں کی تحریریں پچھلے کئی سالوں سے بہت غور سے پڑھ رہی ہوں۔

اس سال بھی الفاظ کی اور زبان وبیان کی جادوگری دیکھی۔ اس نگری کے کچھ سامریوں کی تو میں دل سے گرویدہ ہوں۔ سحر زدہ اس لئے نہ ہو سکی کہ میرے اندر تک پاکستان سے عاشقی ہے۔ خمیر ہی ایسا خبطی ہے۔ کیا کروں؟ اس لئے زبان پر عبور اور بیان میں فتور والی تحریروں کو محض اس بناء پر پسند کرنے سے کتراتی ہوں کہ ان میں ڈھاکہ / کاکول / ڈی ایچ اے / ریٹائرڈ جنرلز / پر تو نما نما سا وار طنز و مزاح کی اوٹ میں کر لیا جاتا ہے مگر جن سپاہیوں ’افسران اور بہاری خاندانوں نے جان و مال اور آبرو کی ان مٹ قربانی دی ان کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ خیر پسند اپنی اپنی اور تخلیقی ترجیحات

اپنی اپنی مگر میں اور میرے جیسے کئی اور لبرلز کیا کریں جو درویشی اور سلطانی دونوں کی عیاری سے واقف ہیں اور اس طرح کی دانشورانہ بددیانتی کو سہ نہیں پارہے۔

ابھی 16 دسمبر کو خاموشی کے ان 51 اذیت ناک سالوں کی مجرمانہ اور شاعرانہ توجیہات پر کڑھ ہی رہی تھی کہ بنگلہ اور انگریزی زبانوں کے اخبارات سے پتہ چلا کہ اس سال محصور بہاریوں کے برباد خاندانوں کے نوجوانوں نے پہلی بار وکٹری ڈے منایا اور شیخ حسینہ واجد سے ان کی حالت زار بہتر بنانے کی اپیل بھی کی۔ نئی نسل کا پاکستان زندہ باد سے بیجوئے شو بھو جاترا (خوشیوں کے جلوس)۔تک کا سفر بے حد کٹھن تھا۔

مگر ان کے لئے کوئی نوبل انعام نہیں۔ ان لوگوں نے نہ بخت سے نہ ہی افلاک سے شکایت کی۔ پاکستان سے ان کو لے جانے والے جہاز کے آنے کے انتظار میں ان تین سے چار لاکھ انسانوں کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اچھا کیا بچو تم نے یہ فیصلہ کیا۔ اللہ آسانیاں دے۔ آپ برابر کے بنگلہ دیشی کہلائیں۔ وہاں سب کا ڈومیسائل برابر ہو۔

ایک پاکستانی ہونے کے ناتے جس کی ایک شناخت بہارن ہونا بھی ہے میں اس خبر کے نظر انداز ہونے پر نجانے کیوں اداس ہو گئی۔ پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو سنبھالا کہ ان لوگوں سے یہاں والوں کا کیا تعلق جو کوئی تکلیف ہو؟ جب امریکی کانگریس میں اکتوبر میں پاکستان کے خلاف 1971 کے حوالے سے بل ٹیبل ہونے پر کوئی ہلچل نہ مچ سکی۔

خدا کرے میرے ایک بھی ہم وطن کے لئے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

---

(13)

بنگلہ دیش میں کیا ہوا؟

https://ibcurdu.com/news/157223/

5اگست، 2024

بنگلہ دیش کی وزیر اعظم شیخ حسینہ نے استعفا دے دیا اور ملک چھوڑ دیا جب مخالف حکومت مظاہرین نے دارالحکومت ڈھاکہ میں ان کی سرکاری رہائش گاہ پر دھاوا بول دیا۔ کرفیو۔۔۔ مارشل لا۔۔ فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔ حسینہ کا گھر اور مجیب الرحمان کا مجسمہ تباہ۔ ملکی میڈیا و غیر ملکی میڈیا بنگلہ دیش میں حالیہ واقعات کو جذباتی نگاہ سے دیکھا جائے تو شاید حسینہ واجد کا غرور ہی انھیں لے ڈوبا۔ یا شائد یہ متحدہ پاکستان کے حامی بہاریوں اور کئی بنگالیوں کی خاموش آہ کا نتیجہ ہے۔ وہ زندگیاں جو تباہ و برباد ہوئیں اور ان کا ساتھ بھی کسی نے نہ دیا۔ بلکہ پاکستان کو دو لخت کرنے والوں اور ان کے حمایتیوں پر انعام و اکرام کی بارش ہی رہی۔ یہ ایک مشکل، کرب ناک اور پر خطر موضوع ہے۔ ایک لٹے پٹے بہاری خاندان سے تعلق ہونے کی بنا پر اور پاکستان میں اس حوالے سے سرد مہری جھیل کر اعصاب اور جذبات کو قائم رکھنا بھی ایک امتحان ہے۔

لہذا، میں نے بنگلہ دیش میں اپنے کچھ دوستوں سے عوامی جذبات کے بارے میں پوچھا جو میری شناخت کے اس پہلو سے بے خبر ہیں اور میں نے ان کے ساتھ مختلف عالمی علمی

فورمز پر کچھ وقت گزارا ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ زیادہ تر بنگلہ دیشیوں نے شیخ حسینہ واجد کے استعفا کو مثبت انداز میں سراہا۔ بدعنوانی کو روکنے میں ناکامی اور لوگوں کے حقوق کے بارے میں سفاک بے پرواہی نے ملک بھر میں طلبہ کے کوٹے کی تحریک کے ذریعے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے۔

پاکستان مخالف یا بنگلہ دیش بنانے والوں کے لیے 30 فیصد کوٹہ جو بنگلہ دیشی سپریم کورٹ نے 5 فیصد کر دیا تھا، اس پر عمل درآمد نہ ہونے پر عوامی رد عمل آیا۔ بھارت نواز جمہوریت نے حکمرانوں کو اپنے ہی لوگوں پر گولیاں چلانے اور تشدد کرنے پر قائل کیا۔

ڈھاکہ میں ہونے والی حالیہ خوں ریز جھڑپوں کی مختلف وجوہات ہیں، جن میں اقتدار سے چمٹے رہنے کی حرص اور عوامی مسائل کو سمجھنے میں ناکامی ایک بنیادی وجہ ہے۔ معاشی چیلنجز جیسے کہ مہنگائی، بیروزگاری، اور زندگی کی بڑھتی ہوئی لاگت عوامی عدم اطمینان اور مظاہروں میں تیزی لاتے ہیں۔ پھر سماجی مسائل سے "ناشناس مجبور" پولیس کی بربریت، طلبہ کے احتجاج، یا سماجی انصاف کے مطالبات نے بھی بڑے تنازعات کو جنم دیا ہے اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

یہ صورتحال بنگلہ دیش کے مستقبل کے لیے ایک اہم موڑ کی نمائندگی کرتی ہے، جہاں عوام کی آواز کو سننا اور ان کے مسائل کا حل تلاش کرنا ضروری ہے۔ عالمی برادری کو بھی اس بحران کے حل میں معاونت فراہم کرنی چاہیے تاکہ خطے میں امن اور استحکام قائم رہے۔ بنگلہ دیش معاشی خودمختاری کی جانب جس رفتار سے بڑھ رہا تھا امید ہے کہ

سمت اور سپیڈ دونوں ہی ٹھیک رہ سکیں۔

سوشل میڈیا پر ہر طرح کے تبصرے اور تجزیے ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب نظر نے لکھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ حسینہ واجد اگرتلہ میں۔ عوامی لیگ نے 60 سال پہلے جہاں سے آغاز کیا تھا، وہاں واپس آگئی ہے، مکمل زندگی کے چکر میں! ایک اور صاحب نے شاعرانہ تبصرہ کر دیا یعنی اس صورت حال پر باقی صدیقی کی غزل فٹ کر دی۔

داغ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیئے جلانے لگے

ایک پل میں وہاں سے ہم اٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

اپنی قسمت سے ہے مفر کس کو
تیر پر اڑ کے بھی نشانے لگے

اس وقت موصوفہ تو بھارت روانہ ہو چکی ہیں اور آخری خطاب بھی نہیں کر سکیں۔ جنرل زمان نے عبوری حکومت قائم کرنے کا عندیہ دے دیا ہے۔ ان کا ذاتی اور پیشہ ورانہ پس منظر بھی دلچسپ ہے۔ جنرل صاحب کی شادی بیگم سارہ ناز کمالیکہ رحمان سے ہوئی ہے، جو مرحوم جنرل مصطفیٰ رحمان کی بڑی بیٹی ہیں اور اس جوڑے کی دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے سسر جنرل مصطفیٰ رحمان نے 24 دسمبر 1997 سے 23 دسمبر 2000

تک بنگلہ دیش فوج کے چیف آف آرمی اسٹاف کے طور پر خدمات انجام دیں؛ وہ وزیر اعظم شیخ حسینہ کے چچا تھے۔ جنرل زمان کی اہلیہ شیخ حسینہ کی کزن ہیں۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

(14)

بنگلا دیشی جنریشن زی اور ہم پاکستانی۔ فرق جان کر جیو پلیز

https://ibcurdu.com/news/157254/

اگست 6، 2024

سوشل میڈیا صارفین کی ایک بڑی تعداد، جید صحافی) صحافی جو کبھی تھے، اب تو صرف نام اور مقام بک رہا ہے (اور اچانک صحافی اور تجزیہ کار بن جانے والے / والیاں اب راتوں رات بنگلہ دیش ایکسپرٹ ہیں اور "اپنی اپنی پسند" کے مطابق یا ہدایت کے تحت بول رہے ہیں، لکھ رہے ہیں۔ یہ "آزادی" بھی انمول ہے اور صحافت کے لیے یادگار ہے۔ وی پی این سے ایکس کی سیر کی تو وہاں بھی کہرام مچا ہوا ہے اور حسب توفیق ہر دانشمند اپنا حصّہ ڈال رہا ہے۔ چونکہ میں نے اس بات کو کبھی نہیں چھپایا کہ میرا کاز تو دھتکارے جانے والے مارے جانے والے بھلا دیئے جانے والے پاکستانی بہاری ہیں۔

خاص طور پر محصورین جن کو پاکستان نے محب وطن ہونے کا صلہ ان کی پاکستانی شہریت چھین کر دیا ہے لہٰذا موجودہ گپ شپ جو پاکستان کے ایک سابقہ صوبے اور حالیہ بنگلہ دیش کے حوالے سے ہو رہی ہے، کوشش کرتی ہوں کہ ان میں حصّہ نہ لوں۔ لیکن مٹی سے جنم بھومی سے تعلق صرف پاسپورٹ کا تو نہیں ہوتا۔ تو یہی حال میرا ہے۔ عجیب سی کیفیت ہے۔ آج بھی قلم اٹھایا ہے تو اس کا سبب ذاتی کرب اور توہین کا واویلا کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک غصہ ہے ان ٹویٹس پر جو کہنے کو تو معروف صحافی خواتین یا حضرت

کی ہیں۔ جو نمائندہ صحافتی فورمز کی ملازمت بھی کرتے ہیں یعنی ان کا باصلاحیت ہونا مستند ہے۔ پھر بھی ان کی ٹویٹس ان کی ناسمجھی کی عکاس ہے۔ بات کو ذرا سمجھیں۔ جب سے مغربی اکیڈمیا نے فیصلہ دیا ہے کہ بنگلادیشی صورت حال جنریشن زی کا پہلا کامیاب احتجاج ہے یا انقلاب ہے۔ یہ ہمارے والے جعلی لبرلز یا لبرل نما (کیونکہ میں بھی ایک لبرل ہوں) بولا گیے ہیں اور لگے ہیں راگ الاپنے کہ پاکستان میں بھی نوجوان کو سامنے لاؤ جوانوں کی حکومت ہو بابوں اور بابیوں کی چھٹی ہو۔

یاد رکھیں کہ اگر دو یا زیادہ چیزیں موازنہ کے قابل ہیں، تو وہ ایک ہی قسم کی ہوتی ہیں یا ایک ہی صورتحال میں ہوتی ہیں۔ ذرا بنگالی لیڈر ناہید اسلام کے بارے میں تو جان لیں۔ روئٹرز کی خبر کے مطابق، چھبیس سال کے ناہید اسلام، جو شادی شدہ بھی ہیں ایک ٹیچر کے بیٹے ہیں۔ وہ اسی طلباء کی تحریک کے کوآرڈینیٹر ہیں جو حکومت کی نوکریوں میں کوٹہ کے خلاف تھی اور جو بعد میں حسینہ واجد کو ہٹانے کی مہم میں تبدیل ہوگئی۔ وہ جولائی 2024 کے وسط میں قومی شہرت میں آئے جب پولیس نے انہیں اور کچھ دوسرے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء کو حراست میں لیا کیونکہ احتجاج خونریز ہو گیا تھا۔

ناہید اسٹوڈنٹس ایگینسٹ ڈسکریمینیشن موومنٹ کے قومی کوآرڈینیٹرز میں سے ایک ہیں۔ یہ موومنٹ بنگلہ دیش میں حکومتی نوکریوں میں کوٹہ نظام کی اصلاح کی مطالبہ کررہی ہے، جو جون 2024 میں بنگلہ دیش کے عدلیہ کے فیصلے کے بعد شروع ہوا، جس نے بنگلہ دیش بنانے کے لیے یعنی "پاکستان سے آزادی کے مجاہدین" کی نسل کے لئے 30 فیصد کوٹہ کو دوبارہ جاندار بنادیا۔ بنگلہ دیش میں گورنمنٹ جابز کے پہلے اور دوسرے

درجے کی کل 56 فیصد نوکریوں میں کوٹے پر منحصر ہے۔ اس کا 30 فیصد حصہ 'آزادی کے مجاہدین' کے ورثاء کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس کوٹہ کو سیاسی طور پر استعمال کیا جانے والا ایک ناانصاف نظام کے طور پر وسعت سے مذموم کیا گیا ہے۔

ناہید اس احتجاج میں ریاستی اداروں کے ہاتھوں خود بھی بدترین تشدد کا نشانہ بنے۔ ہفتوں کے تشدد میں تقریباً 300 افراد، جن میں سے بہت سے کالج اور یونیورسٹی کے طلباء تھے، قتل ہو گئے۔ یہ "ہلاکتیں" صرف اس وقت رکنے لگیں جب پولیس اور فوج نے اپنوں پر گولی چلانے سے انکار کار دیا، جب حسینہ واجد نے استعفیٰ دیا) یا لے لیا گیا(۔ وہ پیر کو ہمسایہ ملک بھارت کی طرف فرار ہو گیئں (یا ان کا رشتے دار جنرل زمان نے ان کے اقتدار کو مزید طوالت سے بچایا اور ان کو محفوظ راہ فرار دے دی)۔ اب جنرل صاحب کو مزاکرات کرنے ہیں ناہید یا ان جیسے ہی نوجوان لیڈرز سے جن کے مطالبات ابھی تسلیم ہونا باقی ہیں۔

اب آجاتے ہیں پیارے پاکستان کی جانب۔ یاد رکھیں پاکستان کی سول سروس میں صرف سات فی صد میرٹ ہے باقی صرف کوٹہ۔ کوٹے سے جڑی بہت تلخ داستانیں ہیں۔ اور ہر شعبے میں ہیں۔ میں کئی بار محکمہ صحت اور تعلیم کے قحط الرجال کا رونا رو چکی ہوں۔ اور یہاں کسی کا ہاضمہ ان ان ترش حقائق پر مبنی کہانیوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔

رہی بات نوجوان قیادت کی یا ان کو پیروں کا استاد کرنے کی تو بات پوری کرنی چاہیئے۔ اشرافیہ نوجوان تو اب بھی صف اول میں ہیں۔ سیاست میں بھی اور اکٹی وزم بھی اور یہ

سلسلہ نسل در نسل سے قائم ہے۔ بر احال تو کمزور طبقات اور کمزور ڈو میسائل والوں کا ہے۔ طبقاتی تفریق اور سماجی نا انصافی کی بات بلوغت کی ہے اور تعلیم بالغان نامی پی ٹی وی پروگرام بھی کب کا بند ہو چکا۔

---

(15)

بنگلہ دیش اور پاکستانی بہاری: حقیقت، خاموشی، اور فکر

https://www.humsub.com.pk/559211/dr-rakhshinda-perveen-10/
09/08/2024

انگریزی کا ایک فقرہ جس کا آزاد اردو ترجمہ کچھ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ”صرف ہم پلہ ہی موازنے کے اہل ہیں“ میرے دماغ میں بار بار آ رہا ہے جب سے میں نے بنگلہ دیش کی حالیہ صورت احوال کے پس منظر میں سوشل میڈیا پر مختلف اسٹیک ہولڈرز بشمول ایسے ”صحافیوں“ کے)جو ان فورمز سے بھی منسلک ہیں جو کبھی معروف اور معتبر فورمز جانے جاتے تھے (تبصرے اور تجزیے پڑھے ہیں۔ ان کا نام میں ممکنہ قانونی کارروائی کے خوف کی وجہ سے نہیں لے سکتی۔ قانون بھی ایلیٹ کا ڈارلنگ ہے۔ کچھ عقلمندوں اور بہی خواہوں کا تو بس نہیں چل رہا کہ ناہید اسلام کو جماعت اسلامی کا لیڈر ہی بنوا دیں اور کچھ نے تو بنوا بھی دیا ہے۔ ایسے بھی ہیں جو بلوچ اور بنگالی میں مماثلت تلاش کر چکے ہیں۔ کچھ کو تڑپ ہو رہی ہے کہ پاکستان میں نوجوان قیادت کیوں نہیں ہے؟ پتا نہیں ان کو اشرافیہ کے نوجوان کیوں نہیں نظر آتے؟ یہ تو مجھ کو نہیں معلوم کہ بنگالی سٹوڈنٹ لیڈر ناہید جو مڈل کلاس سے ہیں اور ایک ٹیچر کی پڑھی لکھی اولاد ہیں پاکستانی اخبارات یا ٹویٹس پڑھتے بھی ہیں کہ نہیں اور نہ ہی پڑھیں تو بہتر کہ ہمارے ”جذبات“ جان کر کہیں حیرت سے بے ہوش ہی نہ ہو جائیں کیونکہ ابھی ان کے ملک میں ان کی

ہوشمندی کی اشد ضرورت ہے۔

بنگلہ دیش جو کبھی پاکستان کا ایک صوبہ تھا۔ یہ صوبہ ہم سے الگ ہوا تھا۔ جدائی کا آغاز تو چودہ اگست 1947 کے کچھ سال بعد ہی یعنی کب کا شروع ہو چکا تھا، ایک سلسلہ تھا سازشوں، ناانصافیوں اور خونریزیوں کا۔ بالآخر 1971 کی جنگ کے بعد اور ہماری اجتماعی قومی توہین اور تضحیک (گر کوئی سمجھے تو) کے ساتھ اس کا سرکاری اعلان ہوا۔

میں بے چین ہوں اور گہری تکلیف محسوس کر رہی ہوں کہ ہمارے "موورز اور سیکرز" میں بنگلہ دیش کی شورش اور مُمکِنہ انقلاب پر غیر معمولی جوش و خروش ہے۔ کاش ایسے محسوسات قابل گرفت بھی ہوتے۔ سب سے زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ 1971 اور بنگلہ دیش پر اچانک علمی اور ماہرین کی توجہ اُبھر رہی ہے۔ راتوں رات کئی خواتین و حضرات بنگلہ دیش پر ایکسپرٹ بن گئے۔ جو چاہے ان کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

وطن عزیز میں عوام کے لیے انٹرٹینمنٹ ناپید ہے۔ بھلا ہو مرحوم ڈکٹیٹر جنرل مشرف کا انھوں نے کرنٹ افیئرز کے بوسیدہ اور بور فارمیٹ کو بدلا اور ان کو بیک وقت اشتعال اور مسخرے پن سے بھرپور شو اور بہت ہی مصالحے دار بنا ڈالا۔ ناظرین نے بھی پوری دلچسپی سے لال مسجد سے لے کر آرمی پبلک اسکول پر حملے کو سانحہ نہیں بلکہ سسپنس سے بھرپور فلم سمجھ کر دیکھا اور یوں ہمارے کئی ٹی وی اینکرز نے رائے ساز بننے کی فضیلت بھی حاصل کی اور ایجنڈا اسیٹنگ، ہوسٹنگ اور اینکرنگ کا اٹوٹ انگ بن گئی۔

یہ ایک عظیم اور ناقابل یقین واقعہ ہی تو ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مطالعہ پاکستان کو مغالطہ پاکستان بنا دیا گیا، جہاں ڈھائی کروڑ سے زیادہ بچے کبھی سکول ہی نہیں گئے،

جہاں آبادی اور نا انصافی بے لگام بڑھ رہی ہے، جہاں ڈھاکہ کے سقوط پر کوئی عالمی معیار کا ہم آہنگ تحقیقی ادارہ نہیں ہے، جہاں ہائی اسکول کا نصاب "مشرقی پاکستان کی تباہی" کو کم کم ہی توجہ دیتا ہے، اور جہاں "بے باک اور آزاد" میڈیا نے اس خونریز تاریخ کے المناک باب پر صحیح بیانیہ کو کبھی بھی مین اسٹریم نہیں کیا۔ یہاں تک کہ آزاد خیال شہریوں یا لبرلز کے درمیان بھی پاکستانی بہاریوں کے لیے کوئی ہمدردی نہیں ہے، اس ملک میں راتوں رات نبگلادیش ایکسپرٹ پیدا ہو گئے۔

میں اسی بدنصیب، بے وطن اور بھلا دی گئی بہاری کمیونٹی سے ہوں جنہوں نے متحدہ پاکستان کے حق میں کھڑے ہو کر پاکستانی فوج کی حمایت کی اور اپنے آزادی پسند بنگالی دوستوں، رشتہ داروں، ساتھیوں اور پڑوسیوں کی پر تشدد ناراضگی کا سامنا کیا، یہ وہی کمیونٹی ہے جس نے بدترین قتل و غارت سہ کر بے گھری جھیلی ہے۔ اسلام آباد میں پروان چڑھتے اور عمر رسیدہ ہوتے ہوئے، اپنی بہاری شناخت کی وجہ سے کئی بار زندگی کے مختلف مراحل میں دھونس، ہراسانی، ذلّت اور امتیازی سلوک کا سامنا کیا ہے۔ تاہم، میری ذاتی مشکلات میرا بنیادی مسئلہ نہیں ہیں۔ جو چیز واقعی دل کو چیر دیتی ہے وہ انسانی حقوق، خواتین کے حقوق، وغیرہ اور آزاد پریس کے نام نہاد چیمپیئنز کی مجرمانہ خاموشی ہے۔

اس کے پیچھے دانشورانہ جواز ہوں گے جو میری محدود سمجھ سے باہر ہیں۔ جب تک میں اپنی کمیونٹی کے بارے میں بے حسی کی منطقی وجہ کو سمجھنے کے قابل ہو جاؤں گی جو پاکستان کے ضیاء کے دور حکومت میں قومی شناخت سے بھی محروم ہوئے (بنگلہ دیش

میں بھی ایک جنرل ضیاء تھا)، شاید مجھے ان مسائل پر خاموش رہنے کی عادت ڈال دینی ہو گی۔ شاید عقل مندی یہی ہے کہ اسلام آباد کے مرکزی مارگلہ روڈ پر بین الاقوامی سطح پر معروف بہاری شاعرہ و بیوروکریٹ پروین شاکر کے نام پر وہ سڑک دیکھ کر ہی سکون تلاش کروں جہاں وہ ایک کار کے حادثے میں 1994 میں شاید قدرتی موت سے گلے ملی تھیں۔

دل نادان پھر بھی چاہتاہے کہ شاید یہ بکھری سوچیں کسی کو میری ناکام نثری نظم نہ لگیں اور شاید یہ چھپ جائیں اور میری خود کلامی ایک بلاگ یا کلام بن کر آپ کے سامنے ہو اور شاید آپ میں سے کسی کا ضمیر بیدار ہو اور پاکستان کا پرچم بلند رکھنے والے پاکستانی بہاریوں کے لیے آپ کا دل نرم ہو جائے۔ شاید لٹے پٹے مجروح بہاری نوجوان جو بنگلہ دیش کے کیمپ نما اذیت خانوں میں اب بھی بے امان ہیں اپنی شناخت کے لیے جدوجہد اور سچائی کی تلاش جاری رکھیں اور وہ صرف امریکا یا کسی یورپی ملک میں مراعات یافتہ بچوں کی فلموں یا تھیسس کا عنوان ہی نا بن کر رہ جائیں۔ کاش ہمارا فارن آفس جاگ جائے۔ یہ مکالمہ اور تفکر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ شاید!

---

(16)

آٹو گراف اور انسان

https://ibcurdu.com/news/159894/

27نومبر2024

تجزیے و تبصرے

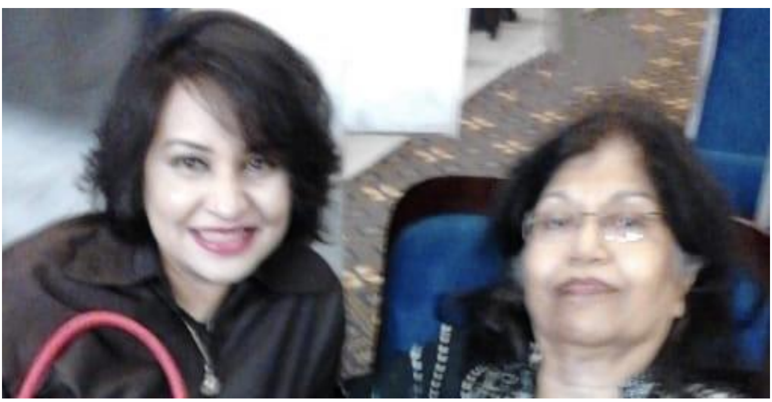

ڈاکٹر رخشندہ پروین

کالم نگار

"معمول" کے حالات ہوں بقول ٹی وی چینلز اور آپ اسلام آباد کے رہائشی بھی ہوں تو اچھا، سچا اور کارآمد کالم لکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی لگا۔ پھر زندگی کو ڈی کلٹر کرنے کے لئے ایک پرانی الماری کو ڈی کلٹر کرنا شروع کیا تو ہائی سکول کے زمانے کی ایک آٹو

گراف بک بر آمد ہوئی۔ گھر میں آنے جانے اور ملنے جلنے والوں میں بہت سے ستارے تھے، زیادہ کا تعلق شعر و ادب اور آرٹ سے تھا۔

اس آٹو گراف بک میں نمی تھی اور قلم سے لکھی ہوئی تحریر یا الفاظ کی روشنائی پھیل گئی تھی۔ بال پائنٹ والے کچھ سلامت تھے۔ ہر آٹو گراف سے جڑی ایک جانی مانی شخصیت تھی، جن کے کام اور نام سے ایک دنیا واقف ہے اور ایک انسان بھی جن سے کوئی کوئی ہی متعارف ہے۔

آج میں کچھ آٹو گرافس آپ کے سامنے لا رہی ہوں

سلیم احمد

بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ پی ٹی وی کے لئے ان کی ڈرامہ سیریز تعبیر ہم نے اپنے بچپن میں دیکھی اور پاکستان کی مزید قدر پالی۔ نئی نسل شائد ہی ان کے نام اور کام سے واقف ہو۔ کتنا اچھا ہو تا کہ تعبیر کو دوبارہ نا صرف پی ٹی وی بلکہ بڑے نجی ٹی وی چینلز پر آج کے حالات میں جب پاکستان سے محبّت قریب قریب ایک جرم ہی ہے یا سزا تو بنا دی گئی ہے، یہ سیریز نئی نسل اور حکومتی اراکین کو روشناس کرائی جاتی۔

سلیم احمد انکل نے میری آٹو گراف بک میں لکھا تھا کہ "خوبصورتی سے دیکھو، خوبصورتی سے سوچو اور خوبصورت بن جاؤ۔"

وہ کراچی کے رہائشی تھے اور اسلام آباد کسی کام سے آتے تو ہمارے گھر ٹھہرتے تھے۔ وہ 27 نومبر 1927 کو بارہ بنکی، اتر پردیش میں پیدا ہوئے اور 1 ستمبر 1983 کو نیند میں ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔

زندگی موت کے پہلو میں بھلی لگتی ہے
گھاس اس قبر پہ کچھ اور ہری لگتی ہے

جوش ملیح آبادی

ان کے حوالے سے ایک کالم "جوش ملیح آبادی اور اسلام آباد کا سلوک: کچھ دھندلی یادیں، فروری 22، کو چھپ چکا ہے 2024۔" ان کا آٹوگراف بھی شامل تھا۔

جوش ملیح آبادی اور اسلام آباد کا سلوک: کچھ دھندلی یادیں

جس کو دیکھو وہ مسکراتا ہے
کون بے کس پر رحم کھاتا ہے

قمر جمیل

قمر جمیل (پیدائش: 10 مئی، 1927ء – وفات: 27 اگست، 2000ء) پاکستان کے معروف نقاد، صحافی، ادیب، شاعر اور اردو ادب میں جدید تر رجحانات کے بانی تھے۔ بہت اچھے مصور بھی تھے۔ میرے اردو شاعری کے مجموعے جو نثری نظموں کا مجموع ہے (مجھے محبّت سے ڈر لگتا ہے) اور ۱۹۹۶ میں شائع ہوا، اس میں ان کا گراں قدر تبصرہ بھی شامل ہے۔ انھوں نے آٹوگراف میں اپنی ایک نظم "دعا" لکھی۔

یہ دعا ہے کوئی گلہ نہیں
میرے ہمنشین میری زندگی

وہ گلاب ہے جو کھلا نہیں
میں یہ سوچتا ہوں خدا کرے

تمہیں زندگی میں وہ سکھ ملے
!جو مجھے کبھی ملا نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ دعا ہے کوئی گلہ نہیں...۔ ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے کئی بار نشر ہوتی تھی، ایس بی جان نے گائی تھی۔ ان کے شاگردوں میں نامور اداکار طلعت حسین بھی شامل تھے اور ان سے بھی ان کے توسط ملاقات ہوئی تھی اور آٹوگراف بھی لیا تھا۔

زاہدہ حنا آنٹی اور انکل جون ایلیا

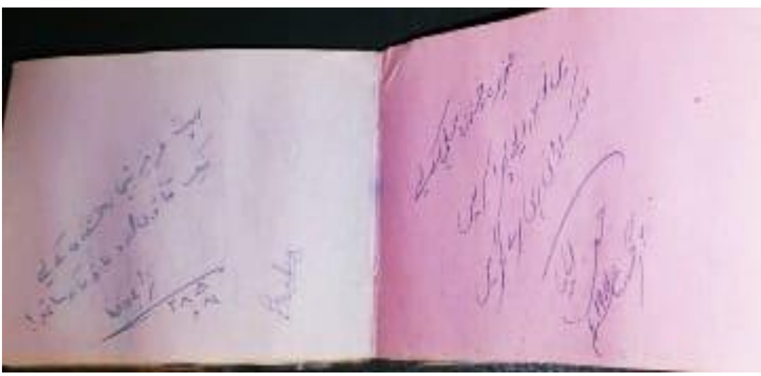

ان کے نام ایک ساتھ اس لئے لکھے کہ میں نے ان کو ایک ساتھ دیکھ تھا۔ یہ میرے سب سے چھوٹے چچا سلطان صدیقی کے کراچی والے گھر میں ۱۹۸۱ میں تشریف لائے تھے۔ ہم لوگ اپنے بڑے پھوپھا کے اچانک انتقال پر ان دنوں کراچی گئے تھے۔

جون انکل بہت مختلف انسان تھے اور کنونشنل معیار پر جیسا کہ اب ایک دنیا جانتی ہے کہ وہ نا اچھے باپ اور نا ہی اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ آنٹی بہار کی ہیں اور ان کی محبت بھی دیگر محبت بھری شادیوں کی طرح ناکام ہوئی۔

میں تو سودا لیے پھرا، سَر میں
خاک اُڑتی رہی مرے گھر میں

زاہدہ حنا کے اپنے بڑے ادبی قد اور بے مثل جد و جہد کو شائد جون انکل کے چکا چوند رومانوی تصور اور مقبول عام کلام نے شائد گرہن لگا دیا۔ آنٹی کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ فیمنسٹ بطور فیشن کہنا آسان ہے مگر ایک فیمنسٹ عورت بن کر رہنا اور اپنے بل بوتے پر زندگی گزارنا بہت کٹھن ہے۔

اچھے ادیب ضروری نہیں کہ اچھے انسان بھی ہوں۔ اس کی ایک مثال تو وہ نامور شاعر ہے جس کے ہاتھوں میں بچپن میں جنسی تشدد کا شکار ہوئی اور اس کا نام ظاہر کیے بغیر انگریزی اور اردو کالمز میں اپنے ساتھ زندگی کی اس بدترین زیادتی کا ذکر کر چکی ہوں۔

اچھے ادیب ضروری نہیں کہ فیمنسٹ بھی ہوں۔ بلکل اسی طرح جس طرح انسانی حقوق کے کارکن اور لیڈران کوئی ضروری نہیں کہ تمام مظلوم انسانوں کے لیے آواز بنیں، قدرت کی تخلیقی اور اخلاقی تقسیم بہت نرالی ہے اور عوام اور نظام کے فاصلوں کی فصیل تو اور بھی نرالی ہے اور مجھے تو آج تک سمجھ نہیں آئی۔

ڈاکٹر رخشندہ پروین نے اپنی نو عمری میں صحافت کا آغاز انگریزی اخبار "دی مسلم" سے کیا تھا۔ وہ اردو اور انگریزی زبانوں میں کالم / بلاگس اور کتابیں لکھتی ہیں۔ مشکل موضوعات پر وکھری باتیں کرتی ہیں، لبرل ہیں، فیمنسٹ ہیں اور پاکستان سے غیر مشروط محبّت کرتی ہیں۔ کبھی شاعری بھی کرتی تھیں۔ مختلف جامعات میں پبلک ہیلتھ، تولیدی صحت، میڈیا اور فیمنسم پڑھاتی بھی رہی ہیں۔ وہ پی ٹی وی پر صبح کی لائیو

نشریات اور حالات حاضرہ کے شو کی پہلی سولو خاتون اینکر ہونے کا بھی اعزاز رکھتی ہیں۔ تعلیمی اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر اور پبلک ہیلتھ سائنٹسٹ ہیں اور صنفی امتیاز کے حوالے سے ان کے کئی ٹی وی اور کمیونٹی پروجیکٹس نمایاں ہیں۔ وہ سچ کے ہمراہ ہونے والی مفاہمت اور عزت کے ساتھ قائم ہونے والے امن کی آرزومند رہتی ہیں۔ قصیدہ گوئی سے نابلد ہیں۔

(17)

ڈائنوسار کی ڈائری سے ایک ادھورا صفحہ

https://www.humsub.com.pk/571344/dr-rakhshinda-perveen-16/

25/11/2024

ایلیٹ اور ایلیٹزم کی بھینٹ چڑھ جانے والی پاکستانی بہاری بین الاقوامی شاعرہ کے نام پاکستان میں سماج، شناخت، کلاس، معاشی حیثیت اور فکری اڑان سے جڑے سمجھوتوں، گردابوں اور عذابوں کو صرف وہی پوری طرح جان سکتے ہیں جو زندگی کو اپنے طریقے سے جینا چاہتے ہوں اور زندگی کو، اس کی تمام رعنائیوں کو اپنی گرفت میں بھی رکھنا چاہتے ہوں۔

یاد کی دھند میں گزرے ماہ و سال میں ایسے انسانوں کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں تو 1978 کی ایک دوپہر ایک ونٹیج کی طرح سامنے نظر آجاتی ہے۔ میں اسکول سے آئی تو دیکھا کہ ہمارے گھر ایک بہت ہی کیوٹ سی لڑکی ساری میں ملبوس موجود تھی۔ ایک مسکراتے چہرے والے صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ پتہ چلا کہ یہ پیارا سا کپل ہمارے سادے سے گھر میں لنچ پر مدعو ہے۔ ابو جان نے مجھ کو دیکھ کر کہا کہ اپنی نظموں والی کاپی لے آؤ، اس کاپی سے ایک صفحہ پھاڑا اور کہا کہ ان سے آٹو گراف لو، یہ اردو کی سب سے بڑی اور مقبول شاعرہ ہوں گی۔ وہ پہلی بار اسلام آباد آئی تھیں انڈیا کا ویزہ لینے۔

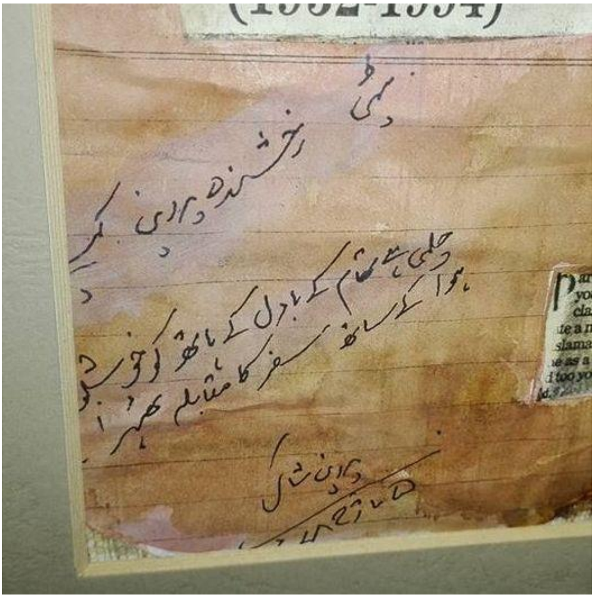

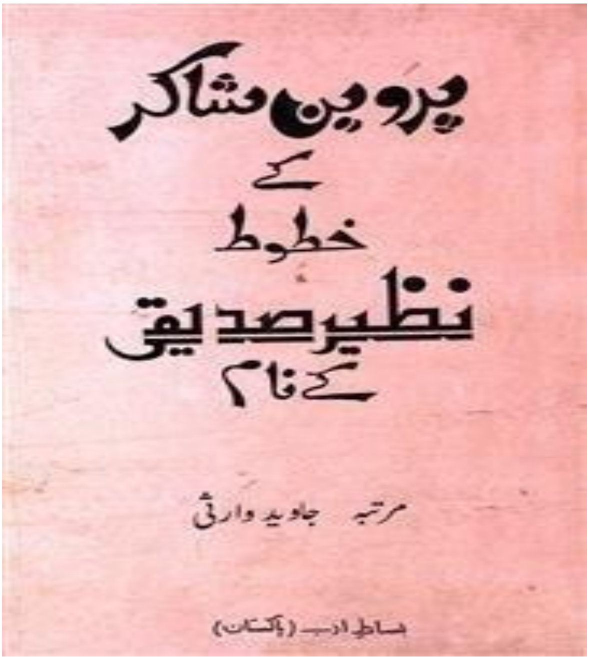
پروین شاکر
کے
خطوط
نظیر صدیقی
کے نام
مرتبہ جاوید وارثی
بساطِ ادب (پاکستان)

میں بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں لیکن پھر سوچتی ہوں، کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

وہ مختصر سی حیات میں بے شمار کام اور اعلیٰ درجے کا علمی اور تخلیقی کام کر کے اس دار فانی سے جا چکی ہیں۔ ان کے مشاعرے، ان کے انٹرویوز، ان کی میزبانی میں ٹی وی پروگرامز، ان کے اردو کالمز، ان کی کتابیں، ان کے کلام پر گائی ہوئی نظمیں اور غزلیں، ان کا درس و تدریس سے وابستہ کیریئر، ان کا سی ایس ایس کرنا، پاکستان کسٹمز سروس کے بارہ سال، ان کے فل برائٹ اسکالر شپس، ان کا ہارورڈ سے پڑھنا، سنگل مدر ہونا، آج بھی اہل ذوق اور خاص طور پر نوجوانوں کے لیے کشش رکھتا ہے۔

زندگی نے ان سے ان کی ذہانت اور ظاہری حسن کا خراج کس طرح لیا، یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں یا اس کا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کی وہ نظمیں اور غزلیں جو ان دکھوں اور کڑواہٹ کی عکاس ہیں، وہ یا تو عام قاری سے اوجھل ہیں یا اس طرح سے ہٹ نہیں ہیں جیسے کہ ان کی وہ شاعری جو بے حد رومانوی ہے اور جس کو خوبصورت میوزک اور گلوکاری نے زبان زد عام بھی کیا اور دوام بھی بخشا۔ وہ بہت خاص تھیں، افسوس ایلیٹ کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ بہار کی، کراچی کی، پاکستان کی عالمی شہرت یافتہ شاعرہ۔ کاش! اس شہرہ آفاق غزل کے اس شعر کے معنی 'اذیت' اور دکھ کو بھی سمجھا گیا ہوتا۔

تیرا پہلو تیرے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

مگر کیوں سمجھا جائے جب فیمینزم اور صنفی امور پر کچھ گروہوں کی اجارہ داری ہو اور بظاہر سنجیدہ فورمز، ماڈرن خواتین اور بے جان بڈھے (عمر کا طعنہ مردوں کو بھی دیا جا سکتا ہے) بھی جنسی لذت کو انٹلیکچولائز کر کے توجہ حاصل کرتے ہیں۔

ان کی نظم مسفٹ کتنے کو یاد ہے؟

مارکیٹ کی ڈیمانڈ ہاٹ ہاٹ مال ہے

ان کی سی ایس ایس کرنے سے پہلے کی نجی زندگی کی سچائی پر مبنی کی جھلک ان خطوط میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو انھوں نے اردو کے ممتاز ادیب و نقاد پروفیسر نظیر صدیقی کے نام بھیجے۔ وہ میرے مرحوم والد بھی ہیں اس حوالے سے بھی بہت سی باتوں پر لکھنا زیب نہیں دیتا۔ بس اتنا ضرور لکھوں گی کہ پروین ایک درد مند دل رکھنے والی زندگی سے محبّت کرنے والی پیاری سی لڑکی تھی۔ جس کو شاید اس پہیلی جس کو نصیب کہتے ہیں نے پیریک فتح کا روٹ دے دیا۔ یہ بے حد خطرناک اور المناک ہوتا ہے۔ حسن، ذہانت، ایمبیشن اور غربت کا امتزاج بہت ہولناک ہوتا ہے۔

پروین شاکر کی ایک نظم "چین ری ایکشن" جو خود کلامی میں شامل ہے، ایسی نظم ہے جو صرف میں سمجھ سکتی ہوں اور میں بھی ایک عمر گزار کر ہی سمجھ پائی۔ اور کسی کو بھی اپنا بے حد ذاتی دکھ اور کرب بتا نہیں سکتی، اور اگر بیان کرنے کی کوشش بھی کروں تو نہ کوئی یقین کرے گا بلکہ بہت سے ان دیکھے مزید خسارے اور مشکلات کا یقین ہے۔

پروین نے ڈیجیٹل مارکیٹنگ اور ففتھ جنریشن وارفیئر کے دور سے پہلے ہی جان لیا کہ سرپرستی اور طاقت کی اپنی الگ ہی تاثیر ہے اور سالک بننے میں بھی کیا مضائقہ ہے؟ یہ

سب بھی بہترین تخلیقی کام کو بھی پذیرائی دینے کے لیے ناگزیر ہیں۔

سوچتی ہوں پروین اگر اسٹیبلشمنٹ کی گڈ بکس میں نہ ہوتیں، ان کو عمر کی حد میں رعایت نہ ملتی، وہ افسر نہ بن پاتی، تو اسلام آباد جس کا فیصلہ ملک کے لیے برباد ہونے والے بہاریوں کے لیے ظالمانہ ہے، کبھی بھی ایک بہارن کے نام پر مارگلہ روڈ سے منسلک سڑک نہ منسوب کرتا، وہ سڑک جہاں وہ 1994 میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ "حادثے" کا شکار ہو کر دنیا کے اسٹیج سے اوجھل ہو گئیں۔

شکریہ کامران لاشاری صاحب، آپ نے اپنی سول سروس کی کولیگ کے نام پر سڑک کا نام رکھ دیا۔ اشرافیہ کی اپنی الگ کلاس ہے اور اس کا بہاری ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اب ایلیٹ ہیں۔

خاص لوگ اشرافیہ اپنے اسٹائل میں ان کو یاد کرتے ہیں اور فوائد بھی حاصل کرتے ہیں۔ عام لوگ اپنے رنگ میں ان کو دیکھتے ہیں۔ کانوں میں "بالی پتہ" (بہار کا زیور ہے) گوری کرت سنگھار کے گیت پر اب بھی مہندی پر جھوم جھوم جاتے ہیں۔ سیاسی بیاں بازی میں "بات تو سچ ہے، بات ہے مگر رسوائی کی" ان کا یہ مصرعہ ضرب المثل بن چکا ہے:

بہت کانٹے دار راہ پر چلیں، مگر لوگوں کو اس سے کیا؟ آپ نے دان بھی تو دے دیا۔ سیدہ پروین شاکر اللہ آپ کے درجات میں اضافہ کرے اور آپ کی اور شاید کئی اور خواتین کی زندگی کو تباہ کرنے یا کوشش کرنے والے تمام صاحبان سے خود انتقام لے۔

---

(18)

نہتے بہاریوں پر گزری قیامت کون بیان کرے گا؟

https://www.humsub.com.pk/565498/dr-rakhshinda-perveen-12/

23/10/2024

کہتے ہیں کہ ناموں کا انسانوں کی زندگی پر اثر ہوتا ہے۔ شاید مقامات کے ناموں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔ سنا ہے کہ اسلام آباد کا اصل نام راج شاہی تھا۔ ایک راج شاہی ہمارے سابقہ مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش میں بھی ہے۔ وہاں کے کیڈٹ کالج سے کئی نامور حضرات کا تعلق ہے جن میں ایک توحید حسین بھی ہیں۔ وہ اس وقت ڈاکٹر محمد یونس کے چیف ایڈوائزر ہیں۔ انہوں نے 1981 میں بنگلہ دیش کی خارجہ سروس میں شمولیت اختیار کی۔ پاکستان سے بخوبی واقف ہیں اور آتے جاتے رہے ہیں۔ پہلی اکتوبر 2024 کو ان کی ایک میڈیا بریفنگ نے میری توجہ مبذول کی۔ انھوں نے واضح کیا کہ موجودہ حکومت نے پاکستان کو کوئی ایسا تاثر نہیں دیا کہ بنگلہ دیش 1971 کے معاملے کو چھوڑ کر اچھے تعلقات بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پھر انھوں نے اپنے ذاتی خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے پاکستان کی طرف سے کوئی بیان نہیں سنا۔ ان کی رائے ہے کہ تعلقات آسان ہو جائیں گے اگر وہ (پاکستان کی حکومت) 1971 میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر کرنے کی ہمت دکھائیں اور مخلصانہ معافی مانگیں۔

توحید صاحب نے مزید کہا کہ بنگلہ دیش چاہتا ہے کہ پاکستان 1971 میں نہتے بنگالیوں پر

کیے گئے مظالم کے لیے عوامی سطح پر ایک رسمی اعلان کے ساتھ معافی مانگے۔ انھوں نے جاپان کا بھی ذکر کیا کہ "جاپان نے دوسری جنگ عظیم میں اپنے اعمال کے لیے معافی مانگی ہے۔ لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر پاکستان کی کوئی حکومت ایسا حوصلہ دکھا سکے اور ایسا بیان دے سکے، تو تعلقات کی نرمی بہت آسان ہو جائے گی۔"

اس بیان اور بیانیے کا تجزیہ تو شاید ہمارے فارن آفس اور میڈیا میں چھائے ہوئے "فارن" تعلقات اور خاص طور پر بنگالیوں کے بارے میں حساس صحافیوں اور ٹاک شو اینکروں نے کر لیا ہو گا، لیکن انھیں ایک نپے تلے انداز میں ہی پبلک کیا جاتا ہے اور وہ بھی شاذ و نادر۔ اور ہمیشہ کی طرح پاکستان کی محبت میں مٹنے والے بہاریوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔

میں نے جب بھی سابقہ مشرقی پاکستان میں متحدہ پاکستان کے حامی غیر بنگالی اردو سپیکنگ لوگوں، (جن میں پنجابی، پٹھان، پشتون، یو پی، سی پی کے لوگ بھی شامل ہیں لیکن سب سے بڑی تعداد بہار سے ہجرت کرنے والے بہاری مسلمانوں کی تھی) کے حوالے سے کوئی مضمون لکھا ہے، پوڈکاسٹ کیا ہے، یا سوشل میڈیا پر کوئی تبصرہ کیا ہے تو مجھے دو طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے: ایک تو سرد مہری اور خاموشی ہے، جیسے کسی نے کچھ سنا ہی نہیں، پڑھا ہی نہیں، یا دیکھا ہی نہیں۔ فیمنسٹ اور انسانی حقوق کے چیمپئن بننے والے پاکستانی بھی خاموش رہتے ہیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ بنا شناخت یا تعارف کے بظاہر بنگالی بن کر نفرت اور توہین آمیز پیغامات موصول ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسی ای میلز میں شناخت نہیں ہوتی، اس لیے یہ مناسب نہیں کہ اسے کسی بنگالی سے

منسوب کیا جائے۔ تاہم، ایک بات جو ان تمام نفرت ناموں میں مشترک ہے وہ بہاریوں کے خلاف یہ الزام ہے کہ سابقہ مشرقی پاکستان کے بہاریوں نے بنگالیوں کو حقیر جانا تھا اور برا سلوک کیا تھا۔

میں نے اس بارے میں پینسٹھ اور اس سے زیادہ عمر کے بہاری لوگوں سے جاننا چاہا کہ اس الزام یا دعوے میں کتنی حقیقت ہے؟ کچھ بہاری بزرگوں کا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان کے بہاری بنگالیوں کو اپنے آپ سے کمتر سمجھتے تھے۔ لیکن اکثریت ایسا نہیں سمجھتی اور اس کا ثبوت ان کی بنگالی خاندانوں میں شادیاں اور ان کا بنگلہ زبان پر عبور ہے۔ بہاری کمیونٹی نے تو گھر لٹنے، جیون جلنے جیسی قیامت سے گزرنے کے باوجود ان بنگالیوں کا شکریہ ادا کرنا کبھی نہیں بھولا جنہوں نے کسی طرح زندہ بچ جانے والوں کی مکتی باہنی کے بلووں اور بربریت سے بچنے میں مدد دی۔ اس تلخ حقیقت کہ باوجود بھی میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہمارے بزرگوں کے کسی رویے نے، جس کا تعلق مغربی پاکستان سے محبت بھی ہو سکتا ہے، بنگالیوں کو ناراض کیا ہو تو ہمیں اس پر ندامت ظاہر کرنے میں تردد نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے بزرگوں نے جو بھی کیا، پاکستان کی محبت میں کیا۔ اس پر بنگالیوں کا ردعمل یعنی نہتے بہاریوں کا سفاکانہ قتل عام، ان کی جائیداد کی لوٹ مار، ان کی عورتوں کی تذلیل ریپ، اور پوری کمیونٹی کی بے گھری بہت غیر متوازن اور غیر انسانی جواب تھا اور کسی / طرح بھی جائز نہیں مانا جا سکتا۔ لیکن زخم کو بھرنا ہو گا، میں آغاز کرتی ہوں معافی مانگ کر اس جرم کی جو میں نے نہیں کیا۔

معافی تلافی کے بغیر ممکن نہیں۔ بہاری کمیونٹی کی تذلیل، توہین اور تتر بتر ہونے کا کیس کوئی نہیں لڑتا۔ ہمارے لیے نہ کوئی ملکی اور نہ ہی عالمی اسٹیبلشمنٹ میں سوچنے والا یا درد رکھنے والا ہے۔ ہم نے پھر بھی پاکستان سے غیر مشروط محبت کی اور کبھی جھنڈا نہیں جلایا۔ ہمارے پاس نہ کوئی ایمن مزاری ہے، نہ ماہ رنگ بلوچ، نہ حامد میر، نہ محمد حنیف۔ ہمارے اپنے لوگ بھی اپنی مفاد پرست سیاست کے قیدی ہیں۔

وہ بہاری اچھے رہے جو پاکستان سے بھی چلے گئے یعنی انہوں نے 1971 سے سیکھا اور امریکہ، کینیڈا وغیرہ کو اپنا نیا گھر بنالیا۔ مجھ سمیت کئی بیوقوف اب بھی اس امید میں ہیں کہ ہماری بپتا بھی سن لی جائے، ہمیں بھی عزت دی جائے، اور ہمارے لوگوں کو وطن واپس بلا لیا جائے۔ یہ دیوانے کا خواب ہے جو میں شاید اپنی آخری سانس تک دیکھوں گی۔

رہی بات توحید صاحب کی سرکاری اور غیر سرکاری آرزو کی تو میں آپ اور آپ جیسے لوگوں کی خدمت میں یہی عرض کر سکتی ہوں کہ میرے مرحوم باپ نے ایک گھر بنایا تھا جو ڈھاکہ میں ہے۔ ابو جان نے میرے جھولے اور اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی کتابوں کے ذخیرے کے ساتھ بھرا ہوا گھر چھوڑ دیا۔ پتہ ہے C / 69 ایوب گیٹ، ایوب ایونیو محمد پور، ڈھاکہ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایوب گیٹ کا نیا نام اسد گیٹ اسد ایونیو ہے، جو عوامی لیگ کے کارکن کے نام پر ہے۔ ہم نے کبھی کلیم نہیں کیا۔ اسی طرح ہزاروں بہاری خاندان ہیں جنھوں نے بسے ہوئے گھر، کاروبار، نوکریاں اور پیاروں کے

لاشے چھوڑ دیے۔ جو جنگی جرائم مکتی باہنی نے نہتے بہاریوں پر کیے، اسے آپ آزادی کی جدوجہد قرار دیتے ہیں۔

کیا آپ معافی مانگیں گے؟

(19)

ڈھاکہ والا گھر اور بھٹو صاحب

https://www.humsub.com.pk/566524/dr-rakhshinda-perveen-13/

29/10/2024

ایک کالم (نہتے بہاریوں پر گزری قیامت کون بیان کرے گا؟) جو "ہم سب" پر 06 اکتوبر 2024 کو شائع ہوا، میں نے اپنے مرحوم والد کے ڈھاکہ والے گھر کی بات قلمبند کی تھی۔ کچھ نے پوچھا، "اب کون رہتا ہے؟" میں نے کہا، "مجھے کیا معلوم؟ میں نے تو پتا بھی پوچھ پوچھ کر لکھا تھا۔" یہ دنیا ایک سرائے ہی تو ہے۔ اس گھر پر اب پروفیسر نظیر صدیقی کا نام نہیں لکھا ہوا ہے، جن کی وجہ سے کبھی ڈھاکہ پہچانا بھی گیا تھا۔ وہ اردو اور انگریزی زبانوں / ادب کے لکھاری تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے پڑھے تھے۔ ان کی نیم پلیٹ وہاں نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ 22 دسمبر 1969 کو ہی مغربی پاکستان آ گئے تھے۔ انہوں نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا، اور ان کے خیر خواہ بنگالی بزرگ، گاندھی جی کے پرسنل سیکرٹری محمود قاضی صاحب، نے بھی ممکنہ قتل و غارت کا عندیہ دیا تھا۔ پھر ایک دن، ان کے گھر کی سیڑھیوں تک ایک نوجوان لڑکوں کا جتھا آ گیا تھا۔ امی بتاتی ہیں کہ وہ بنگالی زبان بھی روانی سے بول سکتی تھیں، اور اسی دن فرید پور کی ہماری بنگالن بوا بھی شاید ہماری جان بچانے کا وسیلہ بھی بن گئیں۔ ہر ایک اجنبی سے پوچھیں جو اپنے گھر کا پتہ جانتا تھا۔

میں نے اس کالم میں ڈھاکہ کے محمدّ پور کے اس گھر کا پتہ بھی لکھا۔ 69 / سی ایوب ایونیو، نزد ایوب گیٹ سے اسد ایونیو، نزد اسد گیٹ ہونے تک کی کہانی پاکستان سے غیر مشروط اور بے لوث محبّت کرنے والی مشرقی پاکستان میں ہجرت کر کے آنے والی، بسنے والی، بہاری کمیونٹی کی بربادی سے بنی گئی ہے۔ محب وطن پاکستانی بہاریوں کے دکھوں ،اور دھوکوں پر ان افراد اور طبقات کی خاموشی اور بے حسی کا رونا میں بار بار رو چکی ہوں جن کی پاکستان میں سنی جاتی ہے یا اگر وہ کچھ سنائیں تو اس سے ان کو خسارہ نہیں ہو گا۔ تاہم اس المناک باب کے حوالے سے سنجیدہ مکالمے کا آغاز ہو سکتا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان میں سیاسی، سول اور ملٹری بیوروکریسی کے ساتھ ساتھ ایلیٹ فیمینسٹ اور انسانی حقوق کے چیمپیئنز، میڈیا اور کئی ایوارڈ یافتہ، ارباب اختیار کے قریبی ایکٹیوسٹ صحافی بھی شامل ہیں۔

مگر میں ناسمجھی کے لینس سے دیکھتی ہوں حالانکہ جانتی ہوں کہ یہاں صرف کاروبار ہوتا ہے۔ منفعت کی کیلکولیشن ہوتی ہے۔ ”ندائے غیب“ سے بیانیے نازل ہوتے ہیں اور اس تمام قصّے میں مقہور اور مجبور بہاریوں کی خاص طور پر ان تین سے چار لاکھ مظلومین کی کوئی جگہ نہیں ہے جن کو محصورین بھی کہا جاتا ہے۔ جن کے بزرگوں سے پاکستان سے محبّت کے جرم میں پاکستانی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء نے ان کو پاکستانی شہریت سے محروم کیا اور ہمارے انسانی حقوق کے ٹھیکے دار خاموش رہے۔ سولہ دسمبر انیس سو اکہتر سے باقاعدہ اجڑنے والوں کی چار بے شناخت نسلوں کی دلخراش داستانوں میں، بنگلہ دیش میں کیمپ نما اذیت خانوں میں ناکردہ گناہوں کی

سزا کاٹنے والوں میں، کوئی بھی تو دلچسپی نہیں رکھتا۔ بدنصیبی میں بھی بدنصیب ترین ہیں۔ فلسطین، لبنان، افغانستان اور بلوچستان کی کم از کام بات تو ہوتی ہے۔ وہ بہاری تو نہ ہی نیوز میکر ہیں نہ ہی نیوز ور تھی نہ ہی نام نہاد امّت مسلمہ کا مسئلہ نہ ہی ٹائم میگزین یا اس جیسے طاقتور اداروں کی دلچسپی کا محور نہ ہی کسی معتبر، بے باک، پاکستانی صحافی کی ضرورت۔ اس لئے کوئی مائک کوئی کیمرہ کوئی اینکر کوئی سوشل میڈیا ستارہ یہاں سے وہاں نہیں گیا۔

میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی "ہم سب" اور ان گنے چنے ڈیجیٹل فورمز کا جنہوں نے بہاریوں کے حوالے سے میرے ماتم اور ذہنی تلاطم کو بلاگز اور کالمز کے ذریعے تسلیم کیا۔

آج میں اس گھر کے حوالے سے ایک تاریخی بات ریکارڈ پر لانا چاہوں گی جو شاید قارئین کے لیے دلچسپ ہو۔ عبدالمنعم خان ایک معروف بنگالی سیاستدان تھے اور مشرقی پاکستان کے طویل ترین عرصے گورنر رہے۔ انہوں نے 1962 سے 1969 تک یہ عہدہ سنبھالا، جو اس خطے کے لیے سیاسی طور پر ہنگامہ خیز وقت تھا۔ بدقسمتی سے، انہیں 13 اکتوبر 1971 کو "بنگلہ دیش کی آزادی" کی جنگ کے دوران قتل کر دیا گیا، ان کی موت اس تنازعہ کے ساتھ آنے والے وسیع پیمانے پر تشدد اور افراتفری کا حصہ تھی۔

ان کا ذکر اس لیے کیا کہ انہوں نے 15 فروری 1966 کو ذوالفقار علی بھٹو کے مشرقی پاکستان کے دورے کے دوران ڈھاکہ میں دفعہ 144 نافذ کی۔ یہ اقدام اس وقت

کی کشیدہ سیاسی صورتحال کے جواب میں کیا گیا، کیونکہ بہت سے لوگ مرکزی حکومت کی پالیسیوں اور بھٹو صاحب کی موجودگی کے خلاف تھے۔ ان کے دورے کو مظاہروں اور مشرقی پاکستان کے لیے زیادہ خود مختاری کے مطالبات کے ساتھ نشان زد کیا گیا، اور حکومت کا دفعہ 144 نافذ کرنے کا فیصلہ عوامی اجتماع اور مظاہروں پر کنٹرول کرنے کے لیے تھا۔

ہمارے محمد پور ڈھاکہ والے گھر کی نچلی منزل کو کرایہ دار تنظیم "انجمن بحالی مہاجرین (1947)" استعمال کرتی تھی۔ بعد ازاں ابّو نے حبیب بینک کو کرائے پر گراؤنڈ فلور دے دیا تھا۔ تنظیم کی وساطت سے بھٹو صاحب کا جلسہ اس گھر میں ہوا، جس میں تقریباً دو ڈھائی سو افراد شریک ہوئے۔ مرحوم ابّو جان نے مشاعرے کے لیے ایک کمرہ بنایا تھا جو اس مقصد کے لیے کام آیا۔ میری امی جو حیات ہیں بتاتی ہیں کہ انہوں نے ایک ٹرے پر اپنی بنگالی بوا کے ہاتھوں بھٹو صاحب کے لیے چائے بھجوائی تھی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا اس میزبانی کی کوئی رقم ادا کی گئی تھی جس پر نہ صرف انھوں نے انکار میں سر ہلایا بلکہ مجھے انتہائی غصے سے بھی دیکھا۔ اس وقت کی اقدار کچھ اور تھیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سرکاری طور پر ہم لوگ نہیں بلکہ ہمارے کرایہ دار اس جلسے کے میزبان تھے۔ والدہ کو آج بھی بھٹو صاحب کا سائیکل رکشہ پر بیٹھ کر اس گھر میں آنا یاد ہے، اور یہ بھی کہ جب جلسے میں کسی نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ ہندوستان کے مصیبت زدہ مسلمانوں کے لیے بھی کچھ کریں گے، تو بھٹو صاحب نے بلا جھجک فوراً جواب دیا کہ وہ صرف مغربی پاکستان میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

رہے نام اللہ کا

سب تاج اُچھالے جائیں گے

سب تخت گرائے جائیں گے

بس نام رہے گا اللہ کا

جو غائب بھی ہے حاضر بھی

جو منظر بھی ہے ناظر بھی

اٹھے گا انا الحق کا نعرہ

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

---

(20)

پاکستانی دانشمندوں کی ”ہمدلی برائے پاکستانی بہاری محصورین“ اور ٹرمپ کا امریکہ

https://www.humsub.com.pk/569630/dr-rakhshinda-perveen-14/

10/11/2024

”متحدہ ہندوستان سے سابقہ مشرقی پاکستان ”ہجرت“ کرنے والے ”پاکستانی بہاریوں کے مسئلے کے حوالے سے ایک ہمدلی یعنی ایمپیتھی پر مبنی سیاسی حل کیا ہو سکتا ہے؟ ہجرت کو واوین میں اس لیے لکھا کہ میرے مطابق وہ ہجرت نہیں تھی بلکہ وہ بہاری) اپنا حق، اپنے ووٹ کا پھل سمجھ کر اپنے گھر آئے تھے۔) یہ سوال خود سے اور کئی جانے ،مانے پاکستانی اساتذہ، دانشوروں، حساس ادیبوں، شعرا، سیاسی کارکنوں اور لیڈروں انسانی حقوق، بچوں کے حقوق، لبرل ازم اور فیمِنسٹ اقدار کے علمبر داروں سے کرتے کرتے میں بوڑھی ہو رہی ہوں۔ چھپن سال کی عمر میں بھی اس محاذ پر لڑنا چاہتی ہوں جہاں ہار یقینی ہے؛ پھر جیتی تو میں وہاں بھی نہیں جہاں پر بہت سے ”بڑے“ اور ”بھلے“ لوگوں نے مجھے دیکھ کر رشک کیا، شاید حسد بھی۔ عقل اور فہم کی کمی اور ایموشنل ذہانت کی عدم دستیابی کا ہمیشہ سے ہی شکار رہی ہوں۔ شاید اسی وجہ سے ہمت ابھی بھی کچھ باقی ہے۔ بات کا آغاز کیا تھا ایک سوال سے۔

ہمدلی۔ ہمدردی نہیں ہے اور اردو زبان اور کسی بھی پاکستانی زبان اور بولی میں انگریزی کے اس لفظ بلکہ نظریے جس کو ایمپیتھی کہتے ہیں کوئی عادلانہ متبادل نہیں ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی والے تو کہتے ہیں کہ ایمپیتھی اگر قدرتی طور پر موجود نہیں ہو تو بھی سیکھی جا سکتی ہے۔ اپنے بے وقعت لفظوں کو کئی بار اس مطالبے میں ڈھالا کہ پاکستان کی سول سروس اکیڈمی، کاکول اکیڈمی، ایلیٹ ایکٹیوسٹس اور ادبی حلقوں میں اس کو سکھانے اور پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔

میں خوابوں میں نہیں رہتی۔ یہ جانتی ہوں، مانتی ہوں اور لکھ بھی چکی ہوں کہ بہاری کمیونٹی کے بارے میں جو خیالات جدی پشتی پاکستانیوں کے ہیں وہ ان کے پرزم سے ٹھیک ہیں۔ شاید میں بھی اگر سندھی، بلوچ، پشتون یا پنجابی ہوتی تو ایسا ہی سوچتی یا ایسے ہی خیالات کا پرچار کرتی۔ ہاں، مجھے ایسے لوگوں کی سلیکٹو انسان دوستی پر اب بھی حیرت ہوتی ہے۔ ان کو دوسری قومیتوں کے حق کے لئے احتجاج کرتے اور صوفی اقدار کا ڈھول بجاتے دیکھ کر ان کے دورنگی نظریات پر دکھ ہوتا تھا اور اب بھی ہے، لیکن میں یا مجھ جیسے کر بھی کیا سکتے ہیں، سوائے اپنی کمیونٹی کے نوجوانوں کو سمجھانے کے کہ پاکستان سے محبت کرو مگر یہ جان کر کہ یہ ہمارا نہیں ہے۔

خود کو کئی بار سمجھایا کہ بہاری المیے کے حوالے سے کچھ بھی لکھنے کا کیا فائدہ؟ مگر پھر سوچتی ہوں کہ جتنی سانسیں رہ گئی ہیں وہ اس کاز، اس مقصد کی نذر کر دوں۔ منافقت، فیک نیوز اور ڈس انفارمیشن کے اس دور میں کچھ سچ بتا کر جاؤں، خاص طور پر اپنے ان پیارے ترقی پسند، لبرل، کمیونسٹ، سوشلسٹ، فیمِنسٹ وغیرہ وغیرہ کی برانڈنگ کے

ساتھ اپنا نام اور مقام بنانے والوں کے لیے جو آج تک باوجود مجھ سے دوستی ہونے کے اور بظاہر بہت احترام دینے کے میرے کرب کو سمجھ بھی نہ سکے۔ جو لوگ گالم گلوچ کرتے ہیں، عامیانہ زبان استعمال کرتے ہیں، ہمیں پیار سے مختلف ناموں سے بلاتے ہیں جیسے مہاجر، مٹروے، ننگے، بھوکے، پودینے کے باغ والے، اور نجانے کیا کیا۔ ان سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی، بس اس حوالے سے اچھے دوستوں کی عداوت اور بے حسی سے ملنے والے رنج وملال کا درجہ کچھ اور ہے۔

پیارے، سچ مچ پڑھے لکھے دوستوں میں سے ایک کا جواب یہ آیا کہ "مجھے نہیں لگتا کہ وہ پاکستانی بہاری پھنسے ہوئے ہیں؛ وہ مشرقی بنگال میں نقل مکانی کر کے آئے تھے اور انہیں اپنی سرزمین کے طور پر اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ بنگلہ دیش کی ریاست کو بھی انہیں اپنے برابر کے شہری کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔ وہ کبھی بھی آج کے پاکستان کا حصہ نہیں تھے، اس لیے انہیں بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کسی نظریے یا سیاسی جذبات کے تحت نہیں آئے تھے، وہ محض ایک سرزمین پر آئے تھے جو مشرقی بنگال تھا اور بعد میں بنگلہ دیش بن گیا۔ انہیں اس سرزمین کے ساتھ اپنی سیاسی وفاداری کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ شاید وہ دو قومی نظریے کی بیان بازی کے شکار ہیں۔ میں ان کے انسانی اور سیاسی حقوق کے حق میں بات کروں گا لیکن ان کی پاکستان ہجرت کی حمایت نہیں کروں گا، کیونکہ اس سے سندھ پر آبادیاتی، اقتصادی اور سیاسی بوجھ پڑے گا۔ حل کو حقیقت پسندانہ، عقلی اور بین الاقوامی انسانی حقوق اور پناہ گزینوں کے چارٹر کے مطابق ہونا چاہیے۔"

اب بنگلہ دیش کو کون قائل کرے گا کہ وہ جن کو میں محصورین لکھتی ہوں وہ عشاق پاکستان کی چوتھی نسل کو وہ برابری کی بنیاد پر شہریت دے۔ ان کے بزرگوں سے کی گئی ناقابل یقین اور ناقابل تلافی زیادتیوں پر معافی مانگے۔ بھلا قتل عام، کاروبار کی تباہی، شناخت کی بربادی، عزت کی نیلامی، حاملہ عورتوں تک کے ریپ کا کیا تدارک ہو سکتا ہے؟ بہار کے مسلمان 1946 میں قتل ہوئے، سید امام نے ڈاکٹر خان کو صوبہ سرحد جا کر خون آلود کپڑے تک دکھا دیے۔ تب جا کر وہاں سے ہارنے والی مسلم لیگ جیت گئی۔ 1947 میں ان بدنصیب بہاریوں نے پاکستان ہجرت کی تھی مشرقی پاکستان ہجرت نہیں کی تھی۔ جناح صاحب نے بہار، یوپی وغیرہ کے سرکاری ملازمین کو مشرقی پاکستان جانے کا حکم دیا تھا۔

پودینے کے باغ یا حویلی کے کلیم پر ہمارے کئی پاکستانی شہرت یافتہ انسان دوست کالم نویس اور دانشور پھبتی کستے رہے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ مشرقی پاکستان میں بس جانے والوں کو کوئی کلیم نہیں ملا۔ عام لوگ جن میں زیادہ تر بہاری تھے، انہوں نے اپنی زندگی محنت کر کے بنائی تھی۔ بنگالیوں کے ساتھ بھی گھل مل گئے تھے، بنگلہ زبان بھی سیکھی اور آپس میں شادیاں تک ہوئیں۔ لیکن بنگالی لوگوں کی محرومی کا تو چرچا ہوا، مگر مکتی باہنی نام کے قہر کی کوئی بات نہیں کرتا جب ویسٹ پاکستانی اشرافیہ کے ظلم کا بدلہ نہتے بہاریوں یا غیر بنگالی اردو اسپیکرز سے لیا گیا۔ میڈیا بلیک آؤٹ بھی ہوا۔ خود ساختہ فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان کو کوئی دوش نہیں دیتا یا جرات نہیں رکھتا۔ بھٹو صاحب شہید ہیں۔ ان کے دور میں چند ہزار پاکستانی بہاری جو ایک مخصوص پیمانے پر پورے

اترتے تھے، یہاں آ گئے تھے۔ وہ کمسن لڑکے جو پاکستانی فوج کے ساتھ لڑے، کٹ مرے، جو بچے جو اپاہج ہوئے، جو خاندان سے بچھڑ گئے وہ بے سرو سامان رہے یا خیرات کرنے والوں کے لیے وسیلہ ثواب بن گئے۔ ان کا ذکر نہ نصاب میں ہے نہ ہی میں سٹریم میڈیا میں۔

جنرل ضیاء نے صلہ حب الوطنی شہریت چھین کر دے دیا۔ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالے اور کتابیں موجود ہیں کہ ہزار میل دور کی جنگ کون جیت پاتا؟ چہ خوب۔ ان کو اور فوجی قیدیوں کو بلا لیا۔ نیازی نے الیکشن بھی لڑا اور اکیس توپوں کی سلامی لے کر اس دار فانی سے کوچ کیا۔

کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟

ہمارا کوئی وطن نہیں۔ میرے بدن کی مٹی کے علاوہ کوئی مٹی میری نہیں۔ یہ نکتہ میں پنجاب میں مار کھا کر صرف بیس سال کی عمر میں سمجھ چکی تھی اور اس دکھ کو ایک نظم وطن میں جلاوطنی کا پہناوا دے چکی ہوں۔

میں بھی کیا رونا لے کر بیٹھ گئی ہوں؟ دور حاضر کی بات کریں۔ بہاریوں کا، ان "محصورین" کا اللہ مالک۔ ٹرمپ کو امریکہ کا دوسری بار صدر بننے پر مبارک باد دیں۔ وہ امریکہ جہاں سب جانا چاہتے ہیں، وہاں یا کینیڈا اور اس طرح کے ممالک میں امیگرنٹس کے حقوق کی آواز بننے والے پاکستان میں ڈیموگرافی اور معاشی بوجھ کی بات کرتے ہیں اور رائٹس کے لیے مزاحمت کرنے پر ایوارڈ اور فنڈز بھی حاصل کرتے ہیں۔ تین لاکھ پاکستانی بہاری، بنگلہ دیش کے اذیت خانے نما کیمپوں میں رہنے والے در

بدر بہاری خاندانوں، ان کے بچے بچیوں کے لیے کسی کے دل میں جگہ نہیں۔ ان کے بزرگوں سے سخت غلطی ہوئی۔ غلطی کی گناہ کی معافی مل جاتی ہے لیکن ان کی غلطی ان کا گناہ بلکہ جرم یعنی پاکستان سے محبّت ہر گز قابل معافی نہیں۔ چیرس۔

سوچتی ہوں آج کے پاکستان کے کچھ حصّوں میں امن نہیں ہے۔ اس کو حقوق کی جنگ کہیں یا دہشت گردی جانیں یا دشمن ملکوں کی سازش سوال یہ ہے کہ اگر کوئی حصّہ صحیح یا غلط اسباب کے تحت الگ ملک بن جاتا ہے تو کیا پاکستان اس کو آنکھ جھپکتے ہی تسلیم کر لے گا؟ وہاں ان لوگوں کو جو پاکستانی فوج کا ساتھ دیں گے بے یار و مدد گار چھوڑ دے گا اور بقیہ پاکستان کے دانشور یہ بھاشن یہ فیصلہ دیں گے کہ وہ پاکستانی نہیں ہیں انھوں نے مقامی لوگوں سے بے وفائی کی ادھر ہی رہیں یہاں نہ آئیں ہم پر بوجھ نہ بنیں ہمارے ساتھ سیاست میں ریاست میں حقدار نہ بنیں یہی فلاں فلاں چارٹر کہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ وقت ہے کہ ہم ان مشکل سوالات کا سامنا کریں جن سے ہم طویل عرصے سے بچتے آ رہے ہیں۔ قانون پر بھی بات کرنی چاہیے۔ ایک وقت تھا غلامی، نسل پرستی، نسلی اور صنفی امتیاز بھی قانونی طور پر جائز تھا کالونائزیشن (استعمار) بھی قانونی تھا۔ کوئی بھی جواز انسانی حقوق اور ہمدلی سے مطابقت نہیں رکھتا۔

بہاری کمیونٹی کا دکھ انصاف اور مساوات کے حصول میں ایک نظر انداز شدہ پہلو نہیں بن سکتا۔ سوال یہ نہیں کہ ہم ان کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم کب انہیں دیکھنے کا فیصلہ کریں گے؟

پس تحریر: اپنے مہذب دوستوں سے کوئی گلہ نہیں ہے وہ انسانی حقوق کو مانتے ہیں لیکن وہ حقیقت پسند بھی ہیں۔ شاید کبھی وہ اس مشکل مکالمے کا آغاز کر دیں امن کی خاطر اور ہمارے زخموں کا مُداوا بھی ہو جائے۔ شاید۔

(21)

جو رہی سو بے خبری رہی۔

بہاریوں کی پاکستان سے یک طرفہ محبت

https://www.humsub.com.pk/571964/dr-rakhshinda-perveen-18/

02/12/2024

انتساب: سابقہ مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلہ دیش، میں پاکستانی فوجیوں اور شہریوں کی بے گورو کفن لاشوں کے نام، ان بیٹیوں کے نام جن کی حرمت کی حفاظت نا کی گئی اور وہ کلکتہ کے چکلوں میں پہنچائی گئیں، میجر اکرم شہید 1971 نشان حیدر ہللی، راج شاہی کے ہیرو کے نام جو اب بھی دیناج پور بنگلہ دیش میں مدفون ہیں اور ان کی میّت کو پاکستان لانے کا خیال اب تک کسی کو نہیں آیا، اور ان کے نام جو اب بھی شناخت سے محروم ہیں اور ہم ان کو پاکستانی بہاری محصورین کے نام سے جانتے ہیں۔

پچیس نومبر سے دس دسمبر تک صنفی تشدد کے خلاف خاص طور پر خواتین کے خلاف تشدد پر دنیا بھر میں اقوام متحدہ کی چھتری تلے احتجاج ہوتا ہے اور اس کا اختتام انسانی حقوق کے عالمی دن یعنی دس دسمبر کو ہوتا ہے۔ سب ہی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ بم بنانے والے، بم برسانے والے، اسلحہ بیچنے والے، اسلحہ خریدنے والے، جنگ سے پیسہ کمانے والے اور امن کا نوبل انعام حاصل کرنے والے، سرکار بھی اور غیر سرکاری

ادارے بھی۔ منافقت کو مزاحمت کا نام دیا جاتا ہے اور کوریوگرافیڈ ایکٹوزم کے طلسمی حصار میں تھوڑی بہت سچائی پر مبنی حقوق کی جدوجہد اور سماجی فعالیت کو بھی جگہ مل جاتی ہے۔ نہیں جگہ ملتی تو غیر بنگالی اردو بولنے والے سابقہ پاکستانیوں کو جنہوں نے پاکستان کو متحد رکھنے اور پاکستانی فوج کا ساتھ دینے کی عملی اور نظریاتی جدوجہد میں ناقابلِ تصور ناانصافیاں، اذیتیں اور مظالم سہے۔ ان میں سے اکثریت کے بزرگ برٹش انڈیا کے صوبہ بہار سے تھے، جن کی چوتھی اور پانچویں نسل آج بھی "پاکستان" کے ساتھ وفاداری کے جرم میں بنگلہ دیش کے کیمپوں میں قید اور اپنی شناخت کی بربادی کا سامنا کر رہی ہے۔

کئی برسوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں کبھی کبھی تماشے کا حصّہ بھی بن جاتی ہوں۔ کئی سول اور ملٹری اشرافیہ اور انسانی حقوق کی نمائندہ آوازوں کو قریب سے دیکھنے کا بھی موقعہ ملا۔ ان ملاقاتوں کا سیاق و سبق کیا تھا اور میرا تجربہ کیا رہا یا کیسا رہا یہ داستان اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو میرا انٹرویو کر لیں۔

آج تو میں آپ کو حسن کے تجربات کی ایک جھلک دکھاؤں گی جن سے میں نے 1971، مشرقی پاکستان، سقوط ڈھاکہ اور غیر بنگالی اردو سپیکنگ مسلمانوں کے حوالے سے اپنے پوڈکاسٹ میں گفتگو کی۔

حسن 1981 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کا تعلق یوپی سے ہے اور وہ چھے سال کی عمر تک محمّد پور ڈھاکہ میں اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر رہے جہاں سے ان کو ان کے خاندان سمیت جبری طور پر بے دخل کر کے "جنیوا کیمپ" لے جایا گیا۔ ان تھک

محنت، چند مخلص لوگوں کے تعاون اور اللہ پاک کی مدد کی بدولت حسن نے تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا‘ کئی عالمی فیلو شپس حاصل کیے اور اب وہ اس دوزخی مقام جس کو جنیوا کیمپ کے نام سے جانا جاتا ہے میں نہیں ہیں بلکہ اس ملک بنگلہ دیش میں بھی نہیں ہیں۔ لیکن عمر عزیز کا جو بیش قیمت حصّہ انھوں نے دیگر بدنصیب انسانوں کی طرح اس جہنّم میں گزارا اس کا بیان اب بھی ان کی آنکھوں کو نم کر دیتا ہے۔ سولہ دسمبر 1971 کے پاکستانی فوج کے سرینڈر کے بعد ہمارے تقریباً تین لاکھ لوگ کیسی زندگی گزر رہے ہیں اس کی روداد سن کر کسی بھی حساس انسان کے لیے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو گا۔

میں اس کی تفصیل میں نہیں جا رہی لیکن ذرا توجہ دیں کہ ان بے بس لوگوں کی جانب بنگلہ دیش میں پاکستانی ہائی کمیشن کا کیا رویہ رہا ہے اور افسران اور سفیران ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں تو شاید آپ کو تعجب ہو۔ عام بنگالی تو متعصب ہے ہی ہے لیکن فارن آفس کے پاکستانی اسٹاف کے انداز ہی نرالے ہیں۔ امید ہی کی جا سکتی ہے شیخ حسینہ واجد کے بعد کے بنگلہ دیش میں ان رویوں پر نظر ثانی ہو گی۔ گو کہ یہ ایک معجزہ ہی ہو گا۔

حسن نے بتایا کہ ایک بار عاصمہ جہانگیر ڈھاکہ تشریف لائیں تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی طرح ان کو اپروچ کیا اور ان کو ”جنیوا کیمپ“ آنے کی دعوت دی۔ جب عاصمہ نے پاکستانی ہائی کمیشن سے وہاں جانے کی اجازت مانگی تو ان کو بتایا گیا کہ ان کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ وہ لوگ (یعنی ہم بہاری اور غیر بنگالی

اردو اسپیکنگ پاکستان کے لیے مٹ جانے والے، پاکستان سے آنے والی پرواز کا انتظار (کر کر پتھرائی آنکھوں کے ساتھ عدم کو سدھارنے والے بزرگوں کی اولادیں درندے ہیں، مال چھین لیں گے، وہ وہاں محفوظ نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ خیر حسن کی ذاتی ضمانت پر عاصمہ وہاں گئی تھیں مگر یہ سب بے نتیجہ ہی رہا۔ آفرین ہے حسن کی شائستگی پر کہ ان کا جواب یہ تھا کہ اب وہ خاتون اس دنیا میں نہیں ہیں تو کیا تبصرہ ہو اور پھر اس وقت پاکستان مشکل میں تھا کوئی کیا کر سکتا تھا؟ یہ ہے ہماری کمیونٹی کی اقدار اور جڑوں میں بسی ہوئی پاکستان سے محبّت کہ ہم بھرم رکھتے ہیں اور نفرت انگیز پروپیگنڈا نہیں کرتے اور جس پاکستان نے ہمیں لاوارثوں کی طرح چھوڑ دیا ڈمپ کر دیا دھتکار دیا اس پاکستان کا جھنڈا نہیں جلاتے۔ ہم ہر حال میں کہتے ہیں پاکستان زندہ باد۔

میں پچھلے دس بارہ سال سے بہاری کمیونٹی اور بنگلادیشی کیمپس کے محصورین کے مسائل پر آگاہی اور ایم پیتھی پھیلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کیوں؟ شاید بچ جانے والے / والی کی ملامت، جسے انگریزی میں "سروائیورز گلٹ" کہتے ہیں، یا شاید فراز کے :اس شعر کی گونج مرے دل میں رہتی ہے

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

،میری تگ و دو کا راستہ کٹھن ہے۔ مجھ سے کبھی کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ سفر کیسا ہے نہ ہی میں نے خود کو سراہنے کی کوشش کی۔ لیکن اگر کبھی میری باتوں سے خودستائی کا :تاثر گیا ہو تو معذرت خواہ ہوں، کیونکہ

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

حال ہی میں کچھ دوستوں نے میری پسندیدہ فیمنسٹ اور عالمی شہرت یافتہ ادیبہ محترمہ کشور ناہید کے ایک اردو کالم کا لنک بھیجا جو 01 نومبر، 2024 کو روزنامہ جنگ میں چھپا تھا۔ انھوں نے مجھ ناچیز کو ادب کی دہلیز پر خوش آمدید کہا ہے میری تازہ اردو تالیف ”بے وقت کی راگنی“ کے حوالے سے۔

میں ان کی جانب سے اس عزت افزائی اور پذیرائی پر ان کی بہت ممنون ہوں مگر مجھے ادب کے محل یا دربار میں داخل ہونے کی نہ چاہ ہے نہ چاہت۔ میں صرف انسانی حقوق کے حوالے سے اپنی اَدنیٰ کوششوں میں مصروف رہتی ہوں۔ بے منصب ہوں۔ بہت معتوب بھی رہی۔ نہ صرف انگلیاں بلکہ دل، روح اور دماغ تک فگار ہے۔ پھر بھی مقصد سے محبّت کے جنون میں بکتی اور لکھتی رہتی ہوں۔

کشور آپی کا خاص شکریہ کہ انھوں نے اس کتاب میں بے گھر، بے در، بے شناخت لوگوں کے حوالے سے مضامین پر بھی نظر ڈالی اور لکھا کہ ”رخشندہ نے بہاریوں کے مسائل پر فہمیدہ ریاض کی طرح، بہت دکھی انداز میں لکھا ہے۔ حسینہ واجد کے زمانے میں تو بہاریوں کے ساتھ یہ سلوک ہوتا رہا کہ 92 سالہ بزرگ کو پاکستان زندہ باد کہنے پر پھانسی چڑھا دیا گیا تھا۔ حسینہ واجد کے جانے کے بعد، ماحول میں تبدیلی اس حد تک آئی ہے کہ یوم قائد اعظم پہلی دفعہ منایا گیا ہے۔ رخشندہ بار بار ہم سب کو یاد دلاتی ہے کہ وہ جو گزشتہ پچاس برسوں سے خود کو پاکستانی کہنے پر ایک ڈربے میں بند رکھے گئے ہیں۔

کاش حکومت پاکستان ان پر محبت کی نظر کرے۔ مگر سچی بات ہے کہ پاکستان تو لاکھوں افغانیوں کو پناہ دینے کی قیمت معصوم فوجی نوجوانوں اور ملک میں دہشت گردی، ڈاکے اور قتل کی صورت میں گزشتہ چالیس سال سے ادا کر رہا ہے۔"

بڑے طویل عرصے کے بعد عصر حاضر کی کسی بڑی پاکستانی خاتون فیمنسٹ یا کسی ادیب اور صحافی نے میرے اور میری کمیونٹی کے اس المیے کا تذکرہ تو کیا کچھ یک جہتی کا اظہار تو کیا۔ ورنہ بہاری خواتین کے ریپ، اس پوری کمیونٹی کی پامالی، اینٹی پاکستان بنگالیوں کے جرائم، ان کے قتل کے سفاکانہ انداز، ان کی دی گئی اذیتوں اور محبان پاکستان کی بے توقیری پر انسانی حقوق کے چیمپیئنز کی خاموشی معنی خیز ہے۔ اور اس بھیانک ترین سانحہ اور یادداشت کی گمشدگی پر اب تک کوئی نہیں بولا کسی نے میرے بین اور نوحوں کا نوٹس نہیں لیا۔ اس ستم کا بھی کئی بار جہاں جہاں جگہ ملی وہاں تذکرہ کیا۔ مگر بے سود بے ثمر۔ بہت گنجلک منظر نامے ہیں۔

نوجوان ایلیٹ ایکٹوسٹ جیسے ایمان مزاری ہوں یا مقبول انگریزی ناول نگار، بی بی سی کے صحافی اور پاکستانی فضائیہ کے سابق افسر محمد حنیف ہوں، معروف ایکٹوسٹ جبران ناصر ہوں یا بلوچ، پشتون، اور بنگالیوں کے حقوق کا علم اٹھائے زیرک صحافی حامد میر ہوں۔ یا ایسے بہت سے دیگر نام سب ہی اچھے لوگ ہوں گے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تو ہمارے بارے میں نہیں بولتا بلکہ صرف اور صرف ایک خاص زاویہ اختیار کر کے 1971، بنگالیوں کی محرومی اور ان کی تضحیک (جس میں کچھ غلط نہیں) کا ذکر کر کے

اپنے مشن کے ساتھ نتھی کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے قتل عام پر گہری خاموشی ہے۔ بحالی کی بات تو اب ایک بھولا ہوا افسانہ ہے۔ کوئی بھی تو نہیں بولتا۔

بہاری کباب سب کو پسند ہیں، بہاری پروین شاکر کی دلاویز تصویریں اور کلام سب کو پسند ہیں، یہ بکتے ہیں شاید اس لیے یا ان سے سیاست میں حصّے داری یا اس ملک میں حصّے داری کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر برباد اور رنجیدہ چہروں والی اسٹیٹ لیس بہاری کمیونٹی کا ذکر آتے ہی یا تو صرف چپ اختیار کی جاتی ہے، یا پھر نفرت، توہین اور تذلیل کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا یا بے سروپا دلیل سے ان کو غیر پاکستانی قرار دیا جاتا ہے اور انہی ''کیمپس'' میں رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے ''جرم'' بہت سنگین ہے شاید نا قابلِ معافی کیونکہ ہم نے پاکستانی فوج کا ساتھ دیا تھا۔ فوج پر تنقید، فوج سے نفرت اب مقبول بنا دیتی ہے اور عالمی اسٹیبلشمنٹ کی توجہ حاسل ہوتی ہے۔

فوجی بھائیوں سے کیا کہیں؟ اردو زبان کا لفظ ''بھائی'' بھی عجیب ہے۔ روایتی گھرانوں میں اسے تعظیم کے خانے میں رکھا جاتا ہے، جبکہ فلموں میں ''بھائی'' کا مطلب کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں جہاں حضرت موسیٰ کے مخلص بھائی حضرت ہارون کا ذکر ہے، وہیں برادرانِ یوسف کا قصہ بھی موجود ہے۔

فوج کو اپنا محاسبہ کرنے کا مشورہ دینے کی ہمّت کون کرے؟ ہم جیسے تو بالکل نہیں کر سکتے جن کے ساتھ نا کوئی عالمی قوت ہے نا ہی کسی طاقتور سفارت خانے کی میلنگ لسٹ میں

ہیں۔ یہاں یعنی اس دنیا میں صرف اشرافیہ کے لیے آواز اٹھائی جاتی ہے اور صرف وہی بے باک صحافت مزاحمت اور وکالت کر سکتے ہیں۔ اور صورت حال پاکستان میں بھی یہی ہے کہ پاکستان بھی دنیا کا حصّہ ہے۔

سیاست دانوں کی بھی بات کر لیں۔ بہت پڑھے لکھے اور دانشور نما یا مصدقہ دانشور سیاست دان بھی اس معاملے میں رواداری اور ایمانداری کی قوت سے محروم معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ثبوت تو نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں چند سال قبل دیکھا جب ڈاکٹر جنید احمد اپنی کتاب Creation of Bangladesh Myths Exploded پر لیکچر دے رہے تھے اور ذکر آیا بھٹو صاحب کا تو پی پی پی کے جو ممبران پارلیمان وہاں موجود تھے نا صرف انہوں نے واک آوٹ کیا بلکہ ایک دو خواتین اپنی پی ایم ایل (این) کی سہیلیوں کو بھی ہال سے باہر لے گئیں۔ یہ اکادمیا کا ماحول ہے۔

لیکن خاموش رہنا بھی تو حل نہیں ہے شاید عقلمندی ضرور ہو مفاد پرست ٹولے کے لیے۔ کچھ تو کہنا ہو گا۔ جو ہو سو ہو۔ سو ایک مخلصانہ عرض 'اپیل' التجا 'گزارش پیش خدمت ہے خدارا! تغافل برخاست کریں اور تحمل سے بات سن لیں آپ کا بھلا ہے خلق خدا کا بھی بھلا ہے دونوں کا بھلا ضروری ہے۔

ہم تو شاید کبھی بھی پاکستان کے لیے قابل قبول نہیں ہوں گے اور ہم میں سے جو یہاں ہیں وہ بھی آپ کے برابر نہیں۔ مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مابین دوستی کا رشتہ تب ہی آرگینک طور پر پروان چڑھے گا جب ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کیا جائے سابق صدر جنرل مشرف کی آدھی پونی معافی کو مکمّل کیا جائے۔

ہماری کمیونٹی کا بھی ذکر کر کے اور تلافی جس حد تک بھی ممکن ہو کی جائے۔ کم از کم نہتے بہاریوں / غیر بنگالی سابقہ مشرقی پاکستان کے باسیوں پر گزری قیامتوں کا میڈیا میں کا کول اکیڈمی میں اور سول سروس اکیڈمی میں ذکر تو کیا جائے۔ بہاری جینوسائڈ پر ' المیہ 1971 پر سقوط ڈھاکہ پر یہ میڈیا بلیک آؤٹ تو ختم کیا جائے ترپین برس گزر گیے۔ محض قائد اور اقبال ڈے منانے سے مکتی باہنی کے بچوں کے ساتھ گانا گاتے ہوئے تصویریں اور فلمیں بنانے سے ہو سکتا ہے کوئی وقتی فائدہ حاصل ہو جائے مگر گھاؤ بہت گہرے ہیں۔ یہ سب میں کئی بار لکھ چکی ہوں۔

زخم مندمل تب ہوتا ہے جب زخم کے ہونے کا اقرار کیا جائے اس کو چھپایا نہ جائے۔ پیچیدہ اور تکلیف دہ مکالموں کا آغاز کیا جائے۔ اسی طرح بقیہ پاکستان کو بچایا جا سکتا ہے عزت اور وقار کے ساتھ۔ ہم سب کو ایک ایسے پاکستان میں بسنا ہے جہاں تاریخ کو مسخ نہ کیا جائے۔ جہاں شہیدوں کے لہو کا مذاق نہ بنایا جائے۔ جہاں اشرافیہ کی انسانی حقوق اور سیاست پر اجارہ داری نہ ہو۔ جہاں ریاست مشفق ماں ہو۔ جہاں نظام اور عوام یک جان دو قالب ہوں نہ کہ حاکمیت اور رعونت ہو۔

ہم تو اپنی یک طرفہ محبّت کو غیر مشروط محبت کہتے ہیں اور اپنا انجام بھگت چکے ہیں آپ سوچیں آپ کا کیا ہو گا؟

بکھر جائیں کیا جب ہم تماشا ختم ہو گا
میرے معبود آخر کب تماشا ختم ہو گا
کہانی میں نئے کردار شامل ہو گئے ہیں
نہیں معلوم اب کس ڈھب تماشا ختم ہو گا

کہانی آپ اُلجھی ہے یا اُلجھائی گئی ہے
یہ عقدہ تب کھُلے گا، جب تماشا ختم ہو گا
تماشا ختم کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ پردہ کب گرے گا کب تماشا ختم ہو گا

(افتخار عارف)

---

(22)

ہرے سے گہرے ہرے رنگ کے پاسپورٹ تک ایک نوبل انعام یافتہ معاشی سائنٹسٹ کی کہانی

https://ibcurdu-com/news/157324/

9اگست، 2024

چٹاگانگ جس کو اب چٹاگرام کے نام سے جانا جاتا ہے، وہاں کے ایک گاؤں باٹھوآ میں ایک بچہ اٹھائیس جون1940 کو پیدا ہوا، جن کے والد ایک سنیار تھے اور وہ نو بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ وہ اپنے اسکول کے سالوں کے دوران، ایک فعال بوائے اسکاؤٹ تھے اور 1952 میں مغربی پاکستان اور بھارت جبکہ 1955 میں کینیڈا گئے، جہاں انہوں نے جامبوریز میں شرکت کی۔ انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور پھر امریکہ کی وینڈربلٹ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے فل برائٹ اسکالرشپ حاصل کی۔ یہ سچ شائد بہت سے قارئین کے لیے نیا ہو اور حیران کن بھی کہ ان کو یہ قابل فخر اسکالرشپ بطور پاکستانی ملا اور ایسٹ پاکستان یعنی (سابقہ) مشرقی پاکستان کے کوٹے پر ملا۔

خوں آلود ''آزادی'' سے بنائے گئے بنگلہ دیش میں 1972 میں، وہ واپس چٹاگانگ آئے یہ فل برائٹ فیلوز کے لیے لازمی ہوتا ہے۔

1974 میں شدید قحط نے نو آزاد ملک کو لپیٹ میں لے لیا، جس میں اندازاً 15 لاکھ لوگ ہلاک ہو گئے۔ 1976 میں، چٹا گانگ یونیورسٹی کے قریب جوبرا گاؤں میں سب سے غریب گھرانوں کے دورے کے دوران، جوان سال یونس نے دریافت کیا کہ بہت چھوٹے قرضے ایک غریب شخص کی زندگی میں غیر معمولی فرق ڈال سکتے ہیں۔ گاؤں کی خواتین جو بامبو کے فرنیچر تیار کرتی تھیں، انہیں بامبو خریدنے کے لیے سودی قرضے لینے پڑتے تھے اور اپنے منافع کو قرض دہندگان کو واپس کرنا پڑتا تھا۔ روایتی بینک چھوٹے قرضے دینے کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ ان کے خراب ہونے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن انھیں یونس نے یقین دلایا کہ اگر غریبوں کو موقع دیا جائے تو وہ کم سود پر پیسہ لیں گے، محنت کا منافع رکھ سکیں گے، اور اس طرح مائیکرو کریڈٹ یعنی چھوٹا قرضہ ایک قابل عمل کاروباری ماڈل ہے۔

یونس نے اپنے 27 ڈالر 42 خواتین کو قرض دیئے، جنہوں نے ہر ایک قرضے پر 0۔50 بنگلا ٹاکا 0)۔02 ڈالر(کا منافع کمایا۔ اس طرح، یونس کو مائیکرو کریڈٹ کے خیال کا خالق سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصل میں ایک جرمن ماڈل تھا۔ یوں یونس صاحب غریبوں کے بینکر بن کر ابھرے اور اتنا کام کیا اور ان کے لیے اتنی کامیاب لابنگ بھی ہوئی کہ ڈاکٹر محمد یونس نے 2006 میں مائیکرو فنانس کے لیے گرامین بینک کی ساجھے داری میں نوبل امن انعام جیتا اور ساتھ ہی دیگر متعدد اعزازات بھی حاصل کیے، جیسے کہ امریکی صدراتی آزادی میڈل، کانگریس گولڈ میڈل، محمد شبدین ایوارڈ برائے سائنس (1993)، سری لنکا؛ ہیومینٹیرئین ایوارڈ (1993)، کیئر، امریکہ؛ ورلڈ فوڈ پرائز

(1994) وغیرہ وغیرہ۔ زندگی کے اس سفر میں انھوں نے ایک بنگالی فزکس کی پروفیسر کو شریک حیات بنایا اور پوری دنیا میں لیکچرز دیئے اور اپنے اس خواب کا بھی اعلان کرتے رہے کہ وہ غربت کو بنگلہ دیش میں ختم کر کے اس کو میوزیم / عجائب گھر کا ایک آئٹم بنادیں گے۔

بنگلہ دیش نے انسانی ترقی کے اشاریوں میں بہت ترقی کی۔ انسانی ترقی کا ماڈل پاکستانی کشمیری ماہر معیشت مرحوم ڈاکٹر محبوب الحق نے دیا تھا۔ جن کی بنگالن بیگم ڈاکٹر خدیجہ حق خود بھی ایک معاشیاتی ماہر ہیں اور وہی درحقیقت اس مشہور زمانہ ریسرچ کی روح رواں ہیں، جو پاکستان کے بائیس خاندانوں کی معیشت پر اجارہ داری کے حوالے سے تھی اور ڈاکٹر محبوب الحق کے نام سے جانی گئی۔ ڈاکٹر صاحب 64 سال کی عمر میں ۱۹۹۸ کو انتقال فرما گئے۔ ان کے کام کو امرتیا سین نے آگے بڑھایا اور ان کو نوبل پرائز ملا۔ میں اکثر ان کو اپنا لوسٹ نوبل پرائز کہہ کر آہ بھرتی ہوں۔ لیکن ہم پاکستانیوں کی زندگی میں مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں۔ جس طرح فیمنسم کا ایک بہت بڑا نام پروفیسر نائلہ کبیر کا ہے جو پاکستانی سٹوڈنٹ تھیں جب برطانیہ گئیں مگر لوٹیں تو بنگلادیشی تھیں۔ ویسے اب تو وہ برطانوی ہیں اور گلوبل سٹیزن کہلاتی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر یونس کی کہانی ہے۔ جو اب چوراسی سال کی عمر میں بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کی سربراہی کریں گے۔ کتنے ہی اور ایسے جگمگاتے ستارے ہوں گے جو سبز ہلالی پرچم سربلند رکھنے کا عزم لئے ہلکے ہرے رنگ کے پاسپورٹ پر 1971 سے پہلے دیار غیر گئے تھے مگر رنگ سیاست نے ان کو گہرے سبز رنگ کا پاسپورٹ اختیار کرنے پر قائل کیا۔ نجانے

پاکستان کے پاس ایسے طالب علموں کا ان کے کوٹے کا کوئی ریکارڈ ہے بھی کہ نہیں۔

کاش ہم اب ایک ہوش مند قوم بن جائیں، زیاں کا احساس کر لیں اور سب پاکستانیوں کو برابر کا مان کر ساتھ لے کر چلیں۔

(23)

بہاری المیہ: تاریخ کا بھولا باب

5 دسمبر، 2024

پاکستان میں احساس زیاں کے احساس سے بھی مبرا کرنے کے عمل کو بڑی مہارت سے نافذ کیا گیا ہے۔ کچھ شواہد ان تو انسانی ترقی اور صنفی برابری کے شرمناک درجات سے ہی مل جاتے ہیں۔ علم، شعور یا ادراک کی کمی کے نتائج کئی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دردناک نتیجہ یہ بھی ہے کہ وطن سے محبّت ایک فرسودہ اور پھیکا جذبہ بن چکا ہے۔ نئے رجحانات میں قوم پرستی کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ شہیدوں کا مذاق اڑانا جرات کی دلیل بن رہا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ نوبت کیوں آئی؟ شائد مشترکہ مفادات پر مبنی سیاست، شائد مشترکہ قومی جہالت، شائد اشرافیہ کی کرامت۔۔۔۔ وجوہات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے ۔

سانحات در سانحات ہیں

ایک سب سے بڑا سانحہ جس کو چھوٹے سانحوں کی لسٹ میں شامل تک نہیں کیا جاتا وہ ہے پاکستان سے بے مثال محبّت کرنے والی بے نشان بے امان عبرت بنی ہوئی بنگلہ دیش کے ڈربوں میں قید ایک بہاری کمیونٹی کے المیے سے ناواقفیت آپ میں سے کتنے ہوں گے جو اس ”واقعے یا قصّے“ سے صحیح سیاق و سباق کے ساتھ واقف ہوں گے۔ یعنی اپنے

لوگوں کو اپنے مخلص شہریوں کو دھتکار دینا،ڈس اون کرنا اور یہ پالسی اختیار کرنا کہ وہ اسی خطّے میں رہیں جہاں کے لوگوں نے ان کی نسل کشی کی بدترین تشدد کیا اور ہر طرح کی ازیت دی۔

قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں متحدہ کے ہندوستان لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں کی بدولت بدولت خاک وخون سے لکھی ہوئی اور آگ کے دریا میں جلتی ہوئی تاریخ رقم کرکے جو پاکستان بنا تھا وہ سولہ دسمبر 1971 سے بھی بہت پہلے ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا سرکاری مظاہرہ سابقہ مشرقی پاکستان میں تئیس مارچ ۱۹۷۱ میں ہو چکا تھا جب اس وقت کے مشرقی پاکستان میں پاکستانی جھنڈے کو بنگلہ دیش کے جھنڈے سے تبدیل کر دیا گیا تھا اور متحدہ پاکستان کے حامی غیر بنگالی جن کی اکثریت بہاری تھی ان کے بدترین قتل عام کا آغاز ہو چکا تھا۔

ان لوگوں کو ان کے گھروں سے جان بچانے کی خاطر مجبور کر دیا گیا۔ ان کے کاروبار

نوکریاں ختم کر دی گئیں ۔ مردوں کو بنگالی دوستوں نے چن چن کر قتل کیا۔ بہاری بیٹیوں کی عصمت دری روز کا معمول ٹھہری۔ یہ بھی کہا گیا کہ خوش نصیب تھیں وہ عورتیں جو ماری گئیں۔ خوف، دہشت اور وحشت کی ان کہانیوں کو بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ ۱۹٦۹ سے یہ سلسلہ عداوت کا، بغاوت کا چل نکلا تھا، بہت کچھ چھپایا گیا ۔

عجیب خبطی خمیر کی قوم تھی پھر بھی پاکستان زندہ باد کہتی رہی۔ ٹین ایج لڑکے تک پاکستانی فوج کے شانہ بشانہ لڑنے پر تیار ہو گئے اور خدمات سر انجام دیں۔ آج کی دنیا میں ان کو چائلڈ سولجرز کہا جائے گا۔ کون سا ستم تھا جو ان لوگوں پر نہیں ڈھایا گیا۔ پھر سولہ دسمبر کا دن آگیا اور اس روز آنے والی رات کی سحر ہمارے تین لاکھ لوگوں اور ان کی نسلوں کے لیے ابھی تک نہیں ہوئی وہ جو پاکستان کی محبّت میں تباہ ہو گئے اور جن کو پاکستان نے دھتکار دیا۔

1971-1999تک بہاری مسئلے کے حوالے سے کیا پیش رفت ہوئی ؟

اقوام متحدہ اور دیگر اداروں کی کاوشوں کے حوالے سے انٹرنیٹ پر ایک رپورٹ کے مطابق 1971 سے لے کر 1999 تک ہونے والے اہم واقعات کچھ یوں ہیں:

1971 خانہ جنگی کے دوران بہاری کمیونٹی پر متعدد حملے ہوئے کیونکہ انہیں پاکستانی اشرافیہ کے تسلط کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اطلاعات کے مطابق، بنگالیوں نے 1،000 سے زیادہ بہاریوں کو قتل کیا۔ دسمبر 1971 میں، جب بنگلہ دیش ایک آزاد ریاست

کے طور پر وجود میں آیا، تو لاکھوں بہاری / غیر بنگالی اردو اسپیکرز وہیں پیچھے رہ گئے کیونکہ پاکستانی فوج اور قید کے گیے شہریوں کو بھارت منتقل کر دیا گیا۔

1972

جنوری 1972 میں، بنگلہ دیشی فوج کو تمام ہتھیار ضبط کرنے کا حکم دیا گیا، لیکن جب وہ میرپور ڈھاکہ کے بہاری علاقے میں داخل ہوئے تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس تصادم میں دونوں طرف سے تقریباً 100 افراد ہلاک ہوئے اور اس واقعے کے بعد، ہزاروں بہاریوں کو گرفتاری کے بعد قید میں ڈال دیا گیا اور ان پر تعاون کے الزامات عائد کیے گئے۔ 1974 تک، پاکستانی حکومت نے 108،000 بہاریوں کو پاکستان منتقل کیا۔ 1981 تک یہ تعداد بڑھ کر 163،000 تک پہنچ گئی۔

1981

اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے مہاجرین (UNHCR) کی ایک کانفرنس میں، بارہ بین الاقوامی اور قومی تنظیموں نے بنگلہ دیش اور پاکستان کی مدد کے لیے ایک ورکنگ گروپ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا تاکہ ان کی آبادکاری میں مدد کی جاسکے۔

مارچ 1981

اسٹرینڈڈ پاکستانی جنرل ریپیٹریئیشن کمیٹی نے دھمکی دی کہ اگر ان کے لوگوں کی واپسی میں تیزی نہ لائی گئی تو وہ لانگ مارچ، عام بھوک ہڑتال اور بنگلہ دیشی حکومت کی طرف سے عطیہ کردہ گندم کے راشن کا بائیکاٹ کریں گے۔

یکم نومبر – 31 دسمبر 1982

تقریباً 4،600 بہاری (جنہیں عام طور پر "اسٹرینڈڈ پاکستانی" کہا جاتا ہے) کو پاکستان منتقل کیا گیا، جب کہ پاکستانی حکومت کی جانب سے باضابطہ واپسی کے منصوبوں کا کوئی اعلان نہیں ہوا تھا۔ یہ 15 لاکھ امریکی ڈالر کا فضائی آپریشن کویت، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں کی مالی معاونت سے انجام پایا۔ اس کارروائی کو اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے مہاجرین (UNHCR) کے تعاون سے مکمل کیا گیا۔

یکم فروری 1987

کراچی (پاکستان) میں بہاری مظاہرین اور پولیس کے درمیان جھڑپوں کے چوتھے دن ہلاکتوں کی تعداد 8 تک پہنچ گئی، جب کہ 50 افراد زخمی ہوئے۔ مظاہرین ایک بہاری رکنِ پارلیمنٹ، آفاق شاہد، کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے، جنہیں مئی 1986 میں غیر قانونی ہتھیار رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔

9 جولائی 1988

اعلان کیا گیا کہ پاکستانی حکومت نے رابطۃ العالم الاسلامی، جو مکہ میں قائم ایک انسانی ہمدردی کی تنظیم ہے، کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے تاکہ بنگلہ دیش میں موجود تقریباً 2،60،000 بہاریوں کی واپسی میں مدد فراہم کی جا سکے۔

10 جولائی 1989

جب 2،500 بہاریوں نے ڈھاکہ میں پاکستانی سفارت خانے میں داخل ہونے کی

کوشش کی، تو پولیس کے ساتھ جھڑپوں میں 12 افراد زخمی ہو گئے۔ یہ مارچ SPGRC کے زیرِ اہتمام کیا گیا تھا، جس کا مقصد پاکستان واپسی میں تاخیر کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔

13 فروری 1990

تقریباً 300 بہاریوں نے بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ میں مظاہرہ کیا۔ مظاہرین نے سندھ کے وزیر اعلیٰ کا پتلا نذرِ آتش کیا اور کراچی کی جانب کشتیوں کے ذریعے روانہ ہونے کی دھمکی دی، جو حالیہ نسلی تشدد کا مرکز رہا تھا۔

4 اپریل 1991

تقریباً 5،000 بہاریوں نے پورے ملک میں، بشمول دارالحکومت، پاکستان واپسی کے مطالبے کے لیے مظاہرے کیے۔

5 اگست 1991

ڈھاکہ میں تقریباً 2،000 بہاریوں نے پاکستان واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک ”شور شرابے والے“ مظاہرے کا انعقاد کیا۔

19 ستمبر 1991

تقریباً 2،000 بہاریوں نے ڈھاکہ میں مظاہرہ کیا، بنگلہ دیشی حکومت کے مبینہ منصوبے کے خلاف جس میں ان کے رہائشی کیمپوں کو مسمار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔

12 نومبر 1991

پاکستانی حکام نے اعلان کیا کہ ان کی حکومت بنگلہ دیش میں پھنسے بہاریوں کی واپسی کے عمل کو تیز کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

17 نومبر 1991

مسلم ورلڈ لیگ نے دنیا بھر کے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ بہاریوں کی پاکستان واپسی کے لیے فنڈز فراہم کریں، جس کا تخمینہ تقریباً 300 ملین امریکی ڈالر تھا۔

11 اگست 1992

پاکستان اور بنگلہ دیش کی حکومتوں کی جانب سے ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا، جس میں کہا گیا کہ پاکستان بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی واپسی کا آغاز کرے گا۔ اس مرحلہ وار واپسی کا آغاز دسمبر 1992 میں 3،000 خاندانوں کی فضائی منتقلی سے ہوگا۔ یہ بیان بنگلہ دیشی وزیراعظم بیگم خالدہ ضیا کے اسلام آباد کے تین روزہ دورے کے بعد جاری کیا گیا۔

21 ستمبر 1992

پاکستانی ہائی کمیشن نے، رابطۃ بنگلہ دیش (جو کہ سعودی عرب میں قائم خیراتی ادارے رابطۃ العالم الاسلامی کی شاخ ہے) کی مدد سے، بنگلہ دیش میں ہزاروں بہاریوں کو شناختی کارڈ جاری کرنے کا عمل شروع کیا۔

13 دسمبر 1992

ڈھاکہ میں حکومت کی جانب سے اطلاع دیئے جانے کے بعد کہ ان کی پاکستان واپسی

ایک ماہ کے لیے مؤخر کر دی گئی ہے، 2،000 سے زائد بہاریوں نے سڑکوں پر مظاہرہ کیا۔ مظاہرین نے خودکشی کی دھمکیاں دیں۔

10 جنوری 1993

بہاری پناہ گزینوں کی دوبارہ آبادکاری کا آغاز لاہور، پاکستان میں 325 افراد کی آمد سے ہوا۔

11 جنوری 1993

پاکستان کے جنوبی شہر کوٹری میں ایک بم دھماکہ ہوا، جس میں 13 افراد ہلاک ہوگئے۔ یہ بم کوٹری کی ایک بہاری کالونی میں نصب کیا گیا تھا (سندھیوں پر اس دھماکے میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا)۔

12 جنوری 1993

پاکستان کے وزیر برائے پارلیمانی امور، چودھری عامر حسین، نے اعلان کیا کہ پھنسے ہوئے پاکستانیوں کو پنجاب کے 32 اضلاع میں دوبارہ آباد کیا جائے گا، جہاں انہیں مکانات اور روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔

23 جنوری 1993

دکانوں میں دو بم دھماکے ہوئے، جن میں 22 افراد ہلاک اور 100 سے زائد زخمی ہوئے۔ یہ حملے مبینہ طور پر جئے سندھ، ایک قوم پرست گروہ جو اردو بولنے والے بہاریوں کی ہجرت کے خلاف تھا، نے کیے۔

6 مارچ 1993

تقریباً 1،000 بہاریوں نے پاکستان واپسی میں تاخیر کے خلاف احتجاج کیا۔

14 اگست 1993

تقریباً 10،000 بہاریوں نے پاکستان کے یوم آزادی کے موقع پر ڈھاکہ میں ایک ریلی میں شرکت کی۔ ریلی کے منتظمین، اسٹرینڈڈ پاکستانی جنرل ریپیٹریئیشن کمیٹی (SPGRC)، نے پاکستانی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ فوراً ان کی واپسی کا انتظام کرے۔

9 نومبر 1993

تقریباً 1،500 بہاریوں (زیادہ تر خواتین) نے ڈھاکہ میں مارچ کیا اور پاکستانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے درخواست کی کہ وہ انہیں پاکستان لے جائیں۔

27 نومبر 1993

ڈھاکہ میں 1،000 سے زائد بہاریوں نے احتجاج کیا اور دھمکی دی کہ اگر انہیں پاکستان نہ بھیجا گیا تو وہ خودکشی کر لیں گے۔

7 دسمبر 1993

جنیوا پناہ گزین کیمپ میں بہاریوں کے متحارب گروہوں کے درمیان جھڑپوں میں کم از کم 50 افراد زخمی ہوئے۔ یہ تنازع SPGRC (نسیم گروپ) اور SPGRC (اعجاز گروپ) کے دھڑوں کے درمیان ہوا۔ SPGRC (نسیم) کے ایک ترجمان نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے بہاریوں کی واپسی کے اس معاہدے کا احترام کرنے کا وعدہ

کیا ہے جو 1992 میں ان کے پیش رو نواز شریف نے کیا تھا۔

16 جولائی 1994

SPGRC (نسیم) کے رہنما، نسیم خان نے مطالبہ کیا کہ اگست 1992 میں بنگلہ دیشی وزیر اعظم خالدہ ضیا اور اس وقت کے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کے مشترکہ اعلان کے مطابق 3،000 خاندانوں کی جلد واپسی کی جائے۔ خان نے کہا کہ پنجاب میں پہلے ہی 3،000 مکانات تعمیر کیے جا چکے ہیں تاکہ پھنسے ہوئے پاکستانیوں کو آباد کیا جا سکے۔ اب تک صرف 321 بہاریوں کو واپس لایا گیا ہے۔

14 اگست 1994

ڈھاکہ کے قریب پناہ گزین کیمپوں میں بہاریوں نے پاکستان کے یوم آزادی کے موقع پر سیاہ جھنڈے لہرائے اور مظاہرے کیے۔ 23 افراد زخمی ہو گئے، جب 2،000 سے زائد بہاریوں نے پاکستانی سفارت خانے کی طرف مارچ کرنے کی کوشش کی، لیکن پولیس نے انہیں روک دیا۔ پچھلے ہفتے، بنگلہ دیشی حکومت نے ڈھاکہ میں مبینہ طور پر مجرموں کو پناہ دینے کے الزام میں بہاریوں کی پناہ گاہیں مسمار کر دیں۔

19 دسمبر 1994

ڈھاکہ میں ایک احتجاج کے دوران تقریباً 500 بہاریوں نے پاکستان کی جانب مارچ کرنے یا خودکشی کرنے کی دھمکی دی۔ بہاری 1992 کے معاہدے کی شرائط کو پورا کرنے کے لیے ایک شیڈول کے قیام کا مطالبہ کر رہے تھے۔

مارچ 8، 1995: مسلم ورلڈ لیگ کے سربراہ نے کہا کہ پھنسے ہوئے پاکستانیوں کی واپسی اور بحالی کو معطل کرنے کی وجہ فنڈز کی کمی نہیں ہے۔ ایم ڈبلیو ایل اور رابطہ ٹرسٹ بورڈ پاکستانی حکومت نے ان پاکستانیوں کے لیے فنڈز جمع کرنے میں مدد کے لیے قائم کیا تھا۔ مختلف مسلم رہنماؤں نے فنڈز فراہم کرنے کا وعدہ کیا، لیکن وہ پہلے ریپیٹری ایشن پروگرام کے دوبارہ فعال ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ (منی کلپس، 03/08/95)۔

اپریل 18، 1995: تقریباً 1000 بہاریوں نے ڈھاکہ میں مظاہرہ کیا تاکہ پاکستان واپسی میں تاخیر پر احتجاج کیا جا سکے۔ انہوں نے خودکشی کی دھمکی بھی دی۔ (رائٹرز، 04/18/95)۔

اپریل 23، 1995: 500 سے زیادہ بہاری، جن میں خواتین اور بچے شامل تھے، وزیراعظم خالدہ ضیاء کے پاکستان کے دورے سے قبل آٹھ گھنٹے کی بھوک ہڑتال میں شامل ہوئے۔ ایس پی جی آر سی نے ضیاء سے درخواست کی کہ وہ بھٹو پر 1992 کے ریپیٹری ایشن معاہدے پر عمل درآمد کے لیے زور دیں۔ (ڈوئچے پریس۔ ایجنبچور، 04/23/95؛ جاپان اکنامک نیوز وائر، 04/24/95)۔

اپریل 25، 1995: بنگلہ دیش کی وزیراعظم خالدہ ضیاء اور ان کی پاکستانی ہم منصب بے نظیر بھٹو نے پھنسے ہوئے پاکستانیوں کے مسئلے کو حل کرنے کا عہد کیا۔ 1992 میں سندھی عوام کی اس تشویش کے باعث ریپیٹری ایشن معطل کر دی گئی تھی کہ اردو بولنے والے بہاری ان کے صوبے میں آبادیاتی توازن کو متاثر کریں گے، جہاں پہلے ہی

مہاجرین موجود ہیں۔(شینہوا نیوز ایجنسی،04/25/95)۔

جولائی 10، 1995: تقریباً50 بہاریوں نے ڈھاکہ میں پاکستان واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے آٹھ گھنٹے کی بھوک ہڑتال کی اور دھمکی دی کہ اگر کوئی کارروائی نہ کی گئی تو وہ خود کو جلالیں گے۔ ایس پی جی آر سی کے رہنما، نسیم خان نے مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے رہنما الطاف حسین کی طرف سے علیحدہ مہاجر ریاست کے مطالبے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ بہاری پاکستان میں دیگر قومیتوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔(ڈوئچے پریس۔ایجنیجور،7/10/95)۔

اگست 14، 1995: تقریباً5000 بہاریوں نے پاکستان کے یوم آزادی پر احتجاج کیا۔ فسادی پولیس نے ان کی پاکستانی سفارت خانے کی طرف مارچ کرنے کی کوششوں کو روک دیا، جہاں ایس پی جی آر سی کے 11 اراکین نے خود سوزی کرنے کی پیشکش کی تھی۔(رائٹرز،08/14/95)۔

اکتوبر 31، 1995: پاکستان کے وزیر داخلہ میجر جنرل نصیر اللہ بابر نے کہا کہ 20 لاکھ سے زیادہ غیر قانونی تارکین وطن (زیادہ تر کراچی میں) کو ملک بدر کر دیا جائے گا اور پاکستان بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے بہاریوں کو قبول نہیں کرے گا۔ بابر نے کہا کہ انہوں نے دیگر اسلامی ممالک سے کہا ہے کہ وہ ان پاکستانیوں کو قبول کریں، لیکن ایم کیو ایم نے اصرار کیا کہ پاکستان پر اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بہاریوں کو قبول کرے۔(رائٹرز،10/31/95)۔

نومبر 12، 1995: ایس پی جی آر سی کے رہنما نسیم خان نے پاکستانی حکومت کی

جانب سے حال ہی میں 150 بنگلہ دیشیوں کو ملک بدر کرنے پر احتجاج کیا اور کہا کہ اس سے بہاریوں کی واپسی کے امکانات کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہ ملک بدری حالیہ دھمکی کے بعد کی گئی ہے کہ مبینہ غیر قانونی تارکین وطن، جن میں سے 1-6 ملین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بنگالی بولنے والے آباد کار ہیں، کو ملک بدر کر دیا جائے گا۔ (رائٹرز، 11/12/95)۔

نومبر 14، 1995: تقریباً 130 بنگلہ دیشیوں کو پاکستان سے بے دخل کر دیا گیا (اور ڈھاکہ پہنچنے پر گرفتار کر لیا گیا)۔ یہ کارروائی پاکستانی حکومت کی مبینہ غیر قانونی تارکین وطن کو نکالنے کی مہم کا حصہ تھی (رائٹرز، 14/11/95)۔

نومبر 23، 1995: تقریباً 700 افراد نے بنگالی بولنے والے آباد کاروں کی جبری بے دخلی کے خلاف پاکستان میں پُرامن احتجاج کیا۔ مظاہرین، جن میں SPGRC کے اراکین بھی شامل تھے، نے الزام لگایا کہ پاکستان اس معاملے سے توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے (رائٹرز، 23/11/95)۔

نومبر 29، 1995: بنگلہ دیش نے اعلان کیا کہ وہ ان بنگالیوں کو قبول نہیں کرے گا جنہیں پاکستان سے زبردستی نکالا جا رہا ہے۔ 300 سے زائد بنگالی ڈھاکہ پہنچ چکے ہیں، اور بنگلہ دیشی حکومت نے اشارہ دیا کہ اگر وہ اپنی شہریت ثابت نہ کر سکے تو انہیں واپس بھیج دیا جائے گا۔ بنگلہ دیش نے پاکستان سے 1974 کے معاہدے کا احترام کرنے کی درخواست بھی کی ہے، جس کے تحت پاکستان کو پھنسے ہوئے پاکستانیوں کو واپس لینا ہو گا (انٹر پریس سروس، 29/11/95)۔

یکم دسمبر1995: اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC) نے پاکستان پر زور دیا کہ وہ بہاریوں کی واپسی کی اجازت دے۔ یہ تنظیم بنگلہ دیش میں موجود 66 کیمپوں کے لیے مالی امداد فراہم کر رہی ہے جہاں بہاری آباد ہیں (بی بی سی، 1/12/95)۔

4 فروری 1996: سیکڑوں بہاریوں نے پاکستان واپس نہ بھیجے جانے میں تاخیر کے خلاف ڈھاکہ میں احتجاج کیا۔ یہ مظاہرہ SPGRC (اعجاز دھڑے) کے تحت منظم کیا گیا تھا، جس میں پاکستان کے حالیہ بیانات کی مذمت کی گئی کہ بہاریوں کو قبول نہیں کیا جائے گا (رائٹرز، 4/2/96)۔

11 مارچ 1996: جنوبی شہر کھلنا میں تناؤ اس وقت بڑھ گیا جب کچھ بہاریوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان کرکٹ ورلڈ کپ کے میچ کے آغاز پر پاکستانی پرچم لہرایا۔ اس کے جواب میں کچھ بنگالیوں نے پرچم کو آگ لگا دی (ڈیوش پریس ایجنسی، 11/3/96)۔

24 اپریل 1996: ہزاروں بہاریوں نے ڈھاکہ میں پاکستان واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے مظاہرہ کیا (رائٹرز، 24/4/96)۔

جون 1996: عوامی لیگ نے وفاقی انتخابات کے بعد نئی حکومت تشکیل دی۔ شیخ حسینہ واجد، مجیب الرحمان کی بیٹی، وزیر اعظم بنیں۔ حکمران بنگلہ دیش نیشنل پارٹی (BNP) کی حکومت مارچ میں شدید احتجاجات اور پرتشدد مظاہروں کے بعد مستعفی ہو گئی تھی، جس میں 130 افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے تھے۔ عوامی لیگ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ واپسی کے عمل کی تکمیل کے لیے کوششیں کرے گی (ڈیوش پریس ایجنسی، 25/4/96؛ رائٹرز، 11/7/96)۔

10 جون 1996: 66 کیمپوں میں رہنے والے بہاریوں کی حالت بدتر بتائی جاتی ہے۔ جھونپڑی نما حالات کے ساتھ ساتھ یہاں نہ تو مناسب اسکول ہیں اور نہ ہی روزگار کے ذرائع۔ بہاریوں کو بنگلہ دیش کے شہری نہیں سمجھا جاتا، اس لیے ان کے پاس شہری حقوق نہیں ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق وہ پناہ گزین نہیں بلکہ بے گھر افراد ہیں (رائٹرز، 10/6/96)۔

14 گست 1996: سیکڑوں بہاریوں نے ڈھاکہ میں تاخیر کے خلاف مظاہرہ کیا۔ اسی دوران بنگلہ دیش نے پاکستان سے بنگالی بولنے والے مسلمانوں کی بے دخلی کے خلاف احتجاج کیا۔ تقریباً 19 بنگالی بولنے والوں کو کراچی میں اس وقت گرفتار کیا گیا، جب وہ ڈھاکہ سے پہنچے۔ بنگلہ دیش نے انہیں واپس پاکستان بھیج دیا، یہ کہتے ہوئے کہ وہ بنگلہ دیشی نہیں ہیں (رائٹرز، 4/8/96)۔

14 اگست 1996: پاکستانی سفارت خانے کی جانب مارچ کرنے کی کوشش کے دوران سیکڑوں بہاریوں کا پولیس سے تصادم ہوا، اور کچھ نے پاکستان واپسی کے مطالبے پر خود کو آگ لگانے کی کوشش کی (رائٹرز، 14/8/96)۔

18 اگست 1996: پاکستان کے سیکرٹری خارجہ نجم الدین شیخ نے کہا کہ ان کا ملک پھنسے ہوئے بہاریوں کو واپس لینے کے لیے تیار ہے، حالانکہ انہوں نے کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔ ڈھاکہ کے دورے کے دوران سیکڑوں بہاریوں نے شیخ کو اپنی فوری واپسی کے لیے ایک یادداشت پیش کی۔ پاکستان کا دعویٰ ہے کہ کراچی اور اس کے گردونواح میں دس لاکھ سے زائد غیر قانونی بنگالی ہیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران

کراچی میں اردو بولنے والوں، سندھی بولنے والوں اور سرکاری فورسز کے درمیان خونریز تصادم ہوتے رہے ہیں۔ بہاری اردو بولتے ہیں (رائٹرز، 18/8/96)۔

22 اگست 1996: پاکستان نے بہاریوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک اسلامی کوشش کا مطالبہ کیا۔ اسلام آباد نے ان خبروں کی تردید بھی کی کہ اس نے پھنسے ہوئے پاکستانیوں کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے (ایجنس فرانس پریس، 22/8/96)۔

5 ستمبر 1996: پاکستان کے وزیر میجر جنرل داخلہ نصیر اللہ بابر نے کہا کہ جب تک وہ اپنے عہدے پر ہیں، بہاریوں کو واپس نہیں لایا جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ پاکستان واپس آتے ہیں تو "ناپسندیدہ سرگرمیوں" میں ملوث ہو جاتے ہیں (ایشیا ٹائمز، 5/9/96)۔

3 دسمبر 1996: کچھ بہاریوں نے پاکستان واپس جانے کی امید چھوڑ دی ہے۔ انہوں نے ایک نئی تنظیم "کمیٹی برائے بحالی غیر بنگالیوں" تشکیل دی ہے جو بہاریوں کے لیے بنگلہ دیشی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ کمیٹی کا کہنا ہے کہ بہت سے نوجوان بہاری بنگالی زبان بولتے ہیں اور ثقافت کو اپنا چکے ہیں۔ پہلے ہفتے میں، کمیٹی کے مطابق تقریباً 2200 خاندانوں نے شہریت کے لیے درخواست دی۔ تنظیم یہ بھی چاہتی ہے کہ حکومت بہاریوں کو کیمپوں سے باہر نکلنے دے اور مکانات اور اسکول بنانے کے لیے فنڈز فراہم کرے۔ بنگلہ دیشی حکومت نے کمیٹی کی درخواستوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا (رائٹرز، 3/12/96)۔

8 فروری 1997: پھنسے ہوئے پاکستانیوں کی جنرل ریپیٹریشن کمیٹی (SPGRC) کو امید ہے کہ نواز شریف اور مسلم لیگ کی پاکستان میں انتخابی فتح کے بعد واپسی کا عمل جلد شروع ہو جائے گا۔ 1990 کی دہائی کے اوائل میں، شریف کے وزیر اعظم رہنے کے دوران، تقریباً 300 بہاریوں کو واپس بلایا گیا تھا۔ SPGRC کا کہنا ہے کہ اس کے پاکستان میں اردو بولنے والوں پر مشتمل سیاسی جماعت ایم کیو ایم سے قریبی تعلقات ہیں اور وہ واپسی کی حمایت کے لیے اس پر دباؤ ڈالے گی۔ سندھ کے نئے صوبائی حکومت میں ایم کیو ایم اور مسلم لیگ کا اتحاد ہے (ایجنس فرانس پریس، 8/2/97؛ ڈیوش پریس ایجنسی، 14/2/97)۔

8 مارچ 1997: سندھ کے صوبائی حکومت کے اتحاد نے بہاریوں کے مسئلے کو اپنے ایجنڈے میں شامل کیا ہے۔ سابق پاکستانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کہتی ہیں کہ وہ بہاریوں کی واپسی کی مخالفت کرتی ہیں کیونکہ اس سے قومی اتحاد اور سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان تناؤ بڑھ جائے گا (ڈیوش پریس ایجنسی، 8/3/97)۔

24 مارچ 1997: کچھ بہاریوں نے ڈھاکہ میں ایک کھلی دعا کی تقریب منعقد کی، جب بنگلہ دیشی وزیر اعظم شیخ حسینہ نے اپنے پاکستانی ہم منصب نواز شریف سے ملاقات کی۔ واپسی کے مسئلے پر کوئی پیش رفت رپورٹ نہیں کی گئی (رائٹرز، 24/3/97)۔

7 جون 1997: ڈھاکہ میں ایک نجی نیوز ایجنسی "پروب" کی رپورٹ کے مطابق، کم از کم 200 بنگلہ دیشی، جن میں زیادہ تر جماعت اسلامی کے اراکین ہیں، افغانستان میں طالبان کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق، بہاریوں کی ایک بڑی تعداد کو

کیمپوں سے بھرتی کر کے پاکستان بھیجا جارہا ہے تاکہ انہیں تربیت دی جاسکے (ایجنس فرانس پریس، 97/6/7)۔

2000 سے 2024 تک

جنرل مشرف کی معافی کا بیان: اس عرصے میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے سیاسی معاملات اور معاشی حالات میں جو اتر چڑھاؤ آئے، ان سے سب ہی واقف ہوں۔ لیکن محب وطن "پاکستانیوں" کے لیے فرزندان زمین کے دلوں میں کوئی گنجائش پیدا نہ ہو سکی۔ دلی کے "مہاجر ڈکٹیٹر اور صدر پاکستان" جنرل مشرف بھی جب ۲۰۰۲ میں ڈھاکہ گے تو "معافی" بنگالیوں سے تو مانگ لی مگر ہمارے لیے کچھ بھی نہ کہا نہ لکھا۔ ڈان کی ایک انگریزی رپورٹ کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہو سکتا ہے:

DHAKA: President Pervez Musharraf accompanied by his wife Begum Sehba stands with Bangladesh Prime Minister Khaleda Zia and Acting President Jamiruddin Sircar at Zia International Airport after Musharraf's arrival here on Monday.—Reuters

ڈھاکہ، 29 جولائی: صدر پرویز مشرف نے پیر کے روز بنگلہ دیش کی 1971 کی جنگ آزادی کے دوران کیے گئے زیادتیوں پر افسوس کا اظہار کیا، مگر ماضی کو دوستی کے جذبے کے تحت دفن کرنے کی اپیل کی۔

"پاکستان میں آپ کے بھائی اور بہنیں 1971 کے واقعات کے دکھوں کو شیئر کرتے ہیں۔ اس بدقسمت دور میں کی جانے والی زیادتیوں پر افسوس ہے،" صدر مشرف نے ڈھاکہ کے قریب قومی شہداء یادگار پر پھولوں کی چادر چڑھانے کے بعد سرکاری مہمانوں کی کتاب میں لکھا، جو جنگ میں شہید ہونے والوں کے نام ہے۔ "آیئے ماضی کو سخاوت کے جذبے کے تحت دفن کر دیں۔ مستقبل کی روشنی مدھم نہ ہونے دیں۔ آیئے ہم سب مل کر آگے بڑھیں،" مشرف نے کہا، اور یہ بھی کہا کہ "سمجھوتہ کرنے کی ہمت مقابلہ کرنے سے بڑی ہوتی ہے۔" صدر مشرف نے، سرکاری بی ایس ایس نیوز ایجنسی کے مطابق، اپنے ساتھ پاکستان کے عوام کی طرف سے "اپنے بنگلہ دیشی بھائیوں اور بہنوں کے لیے مخلصانہ نیک خواہشات" بھی پہنچائیں۔ "ہم اس سرزمین اور اس کے لوگوں کے لیے امن، ترقی اور خوشحالی کی دعا گو ہیں،" انہوں نے کہا اور یقین ظاہر کیا کہ "ہمارے مشترکہ عزم سے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان دوستی پروان چڑھے گی۔"

شیخ حسینہ واجد کی حکومت کا خاتمہ اور پاکستان کا یوفوریا

اگست ۲۰۲۴ میں شیخ حسینہ واجد کی حکومت ختم ہوئی اور پاکستان میں راتوں رات بنگلہ دیش پر ماہرین پیدا ہو گئے۔ شادمانی کی کیفیات سوشل اور لیگاسی میڈیا پر نمایاں رہیں۔

بھنگڑے ڈالے گئے، اچھی بات ہے مگر ہماری کمیونٹی کی طرف ان کے المیے کی طرف کسی نے نظر نہ ڈالی۔

ایک منقسم قوم؛ بہاری کمیونٹی کے دکھوں کو نظرانداز کرنا

صحافت کے میر ہوں یا مزاحمت کی ماہ رنگ سب ہی بنگالیوں کی محرومی اور ویسٹ پاکستان کے اشرافیہ کا ذکر سلیکٹو انداز میں کرتے ہیں اور نہتے بہاریوں پر بیتی آفتوں کا کیا ذکر ہو جب ان کو وہ جیتے جاگتے تین لاکھ لوگ نظر نہیں آتے جو اب بھی بنگلہ دیش میں زندگی کے بدترین روپ کو سہ رہے ہیں۔

اس دوران سیاستدانوں نے کیا کیا؟ میڈیا کا کیا کردار رہا؟ سول سوسائٹی نے کتنی مزاحمت کی؟ ان تمام حوالوں سے پاکستان کی نا صرف آج کی نئی نسل (13-29 سال تک کے نوجوان) تو بے خبر ہیں ہی ہیں بلکہ ۳۰ سے لے کر ساٹھ برس کے بظاہر ہوش مند افراد جن میں سے کئی ایک کا تعلق تو میڈیا اور ایکادمیا سے بھی، نا صرف بے خبر بلکہ بے بہرہ، بے زار اور بے پرواہ بھی نظر آتے ہیں۔ ان سے زائد عمر کے بزرگوں کا ذکر "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است رواداری ایکٹ" کے تحت نہیں کر رہی حالانکہ یہ کوئی چھوٹی غلطی نہیں ہے۔

بہاری اور اردو سپیکنگ کمیونٹی کا کردار۔ خاموشی اور لاپرواہی

اس مجرمانہ ناواقفیت میں بہاری اور اردو سپیکنگ کمیونٹی سے نفرت اور بیزاری میں مبتلا ادیب، آرٹسٹ، صحافیوں، دانشوروں اور اکٹویسٹس کا جو کردار ہے وہ تو اپنی جگہ خود

ہماری کمیونٹی نے بھی اپنی ذمہ داری نہیں نبھائی۔ پاکستان اور بیرون ملک مقیم ہماری کمیونٹی سے گنتی کے چند لوگ ہوں گے جو ان مصائب اور حادثات کے متعلق بات کرتے ہیں، لکھتے ہیں یا عملی طور پر بنگلہ دیش کے اذیت خانوں جن کو کیمپس کہا جاتا ہے، وہاں محصور تین لاکھ سابقہ پاکستانیوں اور حالیہ بے نشان بدنصیب ترین لوگوں کے لیے جن کو بہاری کہا جاتا ہے، کے لیے کچھ اچھا کیا ہو۔

خیرات دینا مسلے کا حل نہیں بلکہ زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ یہ فریضہ کئی غیر سرکاری ادارے بشمول ڈھاکہ کا پاکستانی ہائی کمیشن کبھی کبھی سر انجام دے دیتے ہیں۔

طاقت ور عہدوں اور متاثر کن رتبوں پر فائز بہاریوں اور اردو سپیکنگ لوگوں نے یا تو اپنی شاخت چھپائی یا کمیونٹی سے بے اعتنائی برتی۔ اکثریت نے صرف اپنی فلاح پر توجہ مرکوز رکھی اور سابقہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے اپنی کمیونٹی کے قتل عام پر زیادہ سے زیادہ آنسو بہا کر خاموش رہے۔ خواتین کی حرمت کی پامالی پر بات کرنا تو اب بھی محال ہے۔ مہاجر سیاست کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔

ہماری کمیونٹی میں کوئی قیادت نہیں کوئی جذبہ نہیں کوئی ہمّت نہیں۔ بہت سوں کو یہ بات کھلے گی اور مجھ کو خوشی ہو گی اگر یہ غلط ہو۔ کسی نے آج تک سوشل میڈیا پر محصورین کے لیے کوئی مؤثر مہم نہیں چلائی۔ کسی نے پاکستانی اور بنگلادیشی حکومتوں کو نہیں جھنجھوڑا۔ امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا، یوکے، یورپ وغیرہ کی شہریت رکھنے والے پڑھے لکھے اور خوش حال بہاری اور اردو سپیکنگ پاکستانی نژاد نے اس حوالے سے

اپنی انسانی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو نہ تو جانا نہ ہی نبھایا۔

فلسطین کے لیے یہ لوگ فیس بک اور وہاٹس ایپ پر ڈی پی لگاتے ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں جہاں کی حکومتیں اسرائیل کی حلیف ہیں مگر جبر کم ہے پر امن احتجاج کی اجازت ہے وہاں ان کے لیے یک جہتی کے مظاہروں میں حصہ لیتے ہیں جو بہت اچھی بات ہے لیکن خود اپنی کمیونٹی کے بدنصیب ترین اور بھلا دیے جانے والے بہن، بھائیوں، بیٹے، بیٹیوں، کے لیے نہ ان کے پاس وقت ہے نہ خدمات کا جذبہ، یا انھوں نے کبھی اس پر کچھ سوچا ہی نہیں۔

بہاری اور اردو سپیکنگ نوجوانوں نے کبھی خود بھی ان معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔ جب ہمیں ہی دکھ نہیں فکر نہیں جب ہم میں ہی ایم پاتھ نہیں تو مخالفین سے کیا شکایات ہوں؟ اچھا ہو کہ اب بھی کچھ مداوہ کر لیں ۔

کم از کم سال میں 2-4 گھنٹے اس کاز کو دیں۔

ہمارے جینوسائڈ کی داستان نئی نسل کو سنائیں۔ اس المیے سے وابستہ تصاویر اور تحاریر کو جمع کریں، دیکھیں، سمجھیں اور سمجھائیں۔

جو لکھ سکتے ہیں وہ ہماری سچی کہانی لکھیں۔ جو تھیٹر، فلم، پینٹنگ، بناتے ہیں وہ اس میڈیم کا استعمال کریں۔ جو کھیل کود میں ہیں، وہ بھی اس کار خیر میں شریک ہوں۔

عظمت اشرف صاحب، پروفیسر جاوید محسن ملک صاحب، احتشام نظامی صاحب، شاہین کمال صاحبہ، فرحت پروین صاحبہ، شبانہ نوید صاحبہ، شہناز پروین صاحبہ، شاہین کمال صاحبہ اور اس ناچیز کی تحاریر اور وی لاگز (ہم سب بہاری ہیں اور مشترکہ دکھ کو جانتے

ہیں) بھی دیکھیں۔ عظمت اشرف صاحب کی انگریزی کتاب ریفوجی جس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے، وہ بھی پڑھ لیں۔

سال کے کچھ خاص دن جیسے کہ سولہ دسمبر یا چودہ اگست ان میں ڈیجیٹل میڈیا پر ہی سہی آگاہی مہم ترتیب دیں۔

ایسے اداروں سے روابط رکھیں جو ہماری کمیونٹی کو بااختیار بنا سکیں اور وہ ان کیمپ نما ازیت خانوں سے نکل سکیں ۔

کچھ نا سہی تو سوشل میڈیا پر جو کونٹینٹ ہے، اس کو لائک کریں اور ہم جیسوں کے نان فنڈڈ یوٹیوب چینلز سبسکرائب کریں۔ اگر فلاحی کام کرنا چاہتے ہیں تو چیپ پروجیکشن سے دور رہیں اور اپنی کمیونٹی کی تصاویر امداد لیتے ہوئے پبلک نا کریں۔ یاد رکھیں ان کی جگہ آپ اور میں بھی ہو سکتے تھے ۔ وہ جس جگہ پر ہیں وہ ان کی آزمائش ہے لیکن ہم جہاں آرام سے ہیں یہ ہمارا بھی کمرہ امتحان ہے ۔

جن کے تعلقات طاقتور طبقات سے ہیں وہ ان کے لیے لابنگ کریں۔ بیرون ملک رہنے والے اپنے ایم پی کو بہاری المیے کے بارے میں آگاہ کریں ۔

کرنے کو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے

انصاف اور انسانیت کا سوال

میں کئی بار لبرل، فیمنسٹ اور پروگریسو طبقات کی فکری بد دیانتی، بے رحمی اور بے حسی کا رونا رو چکی ہوں ۔ جب یہ طبقہ ان تین لاکھ لوگوں کو جو ان بزرگوں کی چوتھی یا پانچویں نسل ہیں جو پاکستان کی طرف سے واپسی کی پرواز بھیجنے کا انتظار کر کر کے جو اپنے

پاکستانی شناختی کارڈز اور ملازمتوں کے کارڈز (میرے بچپن کی دھندلی یادوں میں وی سی آر پر دیکھی گئی ایک دستاویزی فلم بھی شامل ہے، جس میں چند بوڑھے نحیف بہاری مرد اپنے ریلوے کی ملازمت کے کارڈز کمرے کی طرف دکھاتے ہوئے التجا کر رہے تھے کہ انھیں پاکستان بلا لو) دکھا دکھا کر اس دنیا سے چلے گئے۔ یہ دلیل دینا کہ وہ اب پاکستانی نہیں اور اب وہ بنگلہ دیشی ہیں کہاں کی انسانیت اور انصاف پسندی ہے؟ یہ ان لوگوں کی اولادیں ہیں جن کو بنگالی مکتی باہنیوں نے بے دردی سے قتل کیا، ریپ کیا، گھر بار چھین لیے اور جب سولہ دسمبر کو ہتھیار ڈالنے کی تقریب خوش اسلوبی سے ادا کر دی گی تو جو قتل عام کی ایک تازہ لہر سے بچ گیے وہ ان اذیت خانوں میں مقید کر دیئے گے، جن کو ”کیمپس“ کے غلط لقب سے پہچانا جاتا ہے۔ آمر صدر جنرل ضیاء نے حب پاکستان کی سزا ۱۹۷۸ میں ان کی پاکستانی شہریت چھین کر دے ڈالی۔ بنگلہ دیش نے نام نہاد شہریت دینے کا ڈھونگ رچایا۔ یہ بے سر و سامان لوگ مختلف مفاد پرست ٹولوں اور دھڑے بازی کی سیاست کا شکار ہوتے رہے۔

کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اسلام آباد کے پریس کلب کے سامنے جا کر زور زور سے انسانی حقوق کے چیمپئنز وکلا کو، صحافیوں کو اور مفکروں کو نام لے لے کر آواز دوں کے ہمارا ملک ہمارا وطن جبری طور پر لاپتا ہو گیا ہے، ہماری مدد کرو یا ہم سب کو گولی مار دو، ایک دفعہ ہی مار دو۔

بہت بزدل ہوں ایسا نہیں کر پاتی۔ جانتی ہوں کہ ہم میں اور بنگالیوں میں اور بلوچ میں فرق ہے، ان کے پاس زمین تھی، اپنی زمین، ہم ہجرت دار ہجرت کرنے والے پاکستان

کے عشاق۔

واضح رہے کہ میں کسی بھی قومیت یا کمیونٹی کی محرومی اور مظلومیت کو ٹریویالائز نہیں کر رہی۔ میں نے تو کبھی افغان مہاجرین والا استدلال بھی نہیں چنا کہ چالیس لاکھ افغانوں کو تو مہمان بنالیا مگر دربدر پاکستانی بہاری کمیونٹی کے لیے یہاں میزبانی کا قحط ہے۔ میرا دل کانپتا ہے۔ چشم تصور میں کوڑے کے ٹھیلے لیے ڈھاکہ کی گلیوں میں اپنی کمیونٹی کے بچے آجاتے ہیں۔ عورتوں کی مفلوک حالی دیکھ کر بہاری سٹائل کی ساری کے آنچل سے اپنے آپ کو لپیٹتے سمیٹے نجانے کن کن نظروں اور مشکلات سے بچاتی ہوئی اپنی بیٹیاں آجاتی ہیں۔ کبھی کبھی بوڑھے لوگ خیال کے منظر میں آجاتے ہیں، میرپور، محمّدپور اور کئی محلوں میں جہاں سرینڈر سے پہلے ان کے اپنے گھر تھے۔

حل کیا ہے ؟ کس کے پاس ہے ؟ اور حل کون دے گا؟

ہمارے لیے کوئی آواز اٹھانے والا نہیں ہے۔ ہمیں صرف اور صرف خود متحد ہو کر ریاست پاکستان سے رابطے رکھنے ہوں گے ،ان کو حقائق اور انسانیت کا واسطہ دے کر سمجھنے کی کوشش کرنی ہو گی ، ساتھ ہی ساتھ نوجوان محصورین کو نکلنے کے لیے سفارت کاری کرنی ہو گی، بہت دشوار طلب کام ہے، کون کرے گا؟

حل صرف مقتدر حلقوں کے پاس ہے، ان کو سنجیدگی اور خلوص سے ہمیں ساتھ بٹھا کر اس مسئلے کو ڈسکس کرنا ہو گا۔ ڈھاکہ میں عاطف اسلم کے کامیاب کنسرٹ سے موسیقی کی عالمگیریت ایک بار پھر مستحکم ہو گئی اور امیر اور مڈل کلاس کے بنگالی نوجوانوں کو ایک اچھی تفریح مل گئی مگر کیا اس سے اور ان جیسے کئی اور علامتی تفریحی

اقدامات سے ڈھاکہ اور اسلام آباد کے درمیان محبّت اور صلح ہو جائے گی ؟ بہاری المیے کو فارن پالیسی سے مائنس کر کے اور میڈیا کے چہرے سے ہٹا کر کس کو دھوکہ دیا جا رہا ہے ؟

رہنماؤں اور سیاسی شخصیات کا کردار

پاکستان کے رہنماؤں اور سیاسی شخصیات نے 1971 کے بعد بہاری کمیونٹی کے حقوق اور ان کے دکھوں کو کم کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ ان کی خاموشی اور غیر مؤثر اقدامات نے کمیونٹی کو مزید نقصان پہنچایا۔

بین الاقوامی کمیونٹی کی عدم توجہ

بین الاقوامی کمیونٹی نے بھی اس مسئلے پر توجہ نہیں دی۔ بہاری کمیونٹی کے حقوق اور ان کی مشکلات پر عالمی سطح پر کوئی بڑی آواز نہیں اٹھائی گئی، جس کی وجہ سے ان کی حالت میں بہتری نہیں آ سکی۔

نسلی فرق: بہاری کمیونٹی کی طرف سے بے پرواہی

پاکستانی معاشرت میں نسلی فرق نے بہاری کمیونٹی کی حالت کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ان کے ساتھ ہونے والی بے پرواہی نے ان کے حالات کو بدتر کیا ہے اور اس کی بڑی وجہ نسلی تفاوت ہے۔

جوابدہی، ازالے اور اقدامات کی ضرورت

روح پر لگے گھاؤ کبھی بھی بھر نہیں سکیں گے۔ میں جو اسلام آباد میں پلی بڑھی اور بہت توہین سہی ہے اور اب بوڑھی ہو رہی ہوں اس رنج کے ساتھ ہی مروں گی کہ میرا کوئی

وطن نہیں کوئی مٹی میری نہیں۔

اگر پاکستان ہم جیسے بہاریوں سے معافی نہیں مانگ سکتا، اگر ریاست بنگلہ دیش سے ہماری بربادی کا حساب نہیں مانگ سکتی اگر مسلمان اکثریت کا یہ ملک خداداد صرف تین لاکھ بے کس لوگوں کو محبّت اور عزت سے نہیں دیکھ سکتا رکھنا اور واپس بلانا تو دور کی بات ہے تو ہم اللہ سے آپ سب کی شکایات کریں گے۔

وہ قیامت جو سر سے گزری ہے
دیکھیے کب شعور سے گزرے
(پروفیسر نظیر صدیقی مرحوم)

(24)

تذلیل، توہین اور گمشدہ شناختوں کے 19,359 دن

16 دسمبر 1971ء-16 دسمبر 2024 تک

ایک نسلی برادری، جو "بہاری پاکستانی" کے نام سے جانی جاتی ہے، بے دردی سے جانچی گئی ہے۔ میں نے اس کمیونٹی کے حوالے سے، اور خاص طور پر غیر بنگالی یا بہاری پاکستانی محصورین کے لیے، اپنی مقدور بھر دانست میں آواز اٹھانے کی، آگاہی اور ہم دلی بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیشتر میڈیا کے فورمز ایسی تحریر اور رائے کو رد کر دیتے ہیں یا ان کو جگہ دیتے ہیں جن کے عہدے اور مرتبے رعب اور دبدبے والے ہوں۔ ان حالات اور ترجیحات میں "ہم سب" جیسے گنتی کے چند ڈیجیٹل دریچوں کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے۔

میں نے بغیر کسی نیٹ ورکنگ یا اسپانسر شپ کے ان موضوعات پر کئی زاویوں سے اتنا لکھا اور بولا ہے کہ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بتانے یا سنانے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ شاید دامن جھاڑ چکی ہوں۔ لیکن یہ تمام تگ و دو، کامیابی یا مؤثر ہونے کے روایتی پیمانوں سے ناپی جائے تو میں ناکام اور بے اثر رہی ہوں، جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں:

پاکستانی لبرلز اور دانشور طبقات کا اس المیے سے بے رخی اختیار کرنا یا بے حسی دکھانا۔

خود میری کوتاہیاں، جن میں مارکیٹنگ کی مہارت نہ ہونا یا ذاتی کرشمہ نہ رکھنا بھی شامل ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خوش شکل، خوش نما اور خوش مزاج خواتین، جو تلخ اور سنجیدہ معاملات سے دور رہتی ہیں، سے مرد حضرات بہتر سلوک کرتے ہیں۔ مردوں کا ذکر اس لیے کیا کہ ہر شعبے میں مرد ہی لیڈرشپ کی کرسی پر براجمان ہیں، اور کہیں کہیں خواتین ہیں بھی تو وہ مردوں سے بھی زیادہ پدرسری رویوں کی وارث بنی بیٹھی ہیں۔

اس تلخ نوائی اور جذباتی پن پر معذرت

آج کی تحریر کا مقصد کچھ بنیادی حقائق کا خلاصہ پیش کرنا ہے، اس موہوم سی امید پر کہ شاید کہیں پر ایک مظلوم ترین کمیونٹی، ایک لسانی اور نسلی طور پر اقلیت کی تضحیک اور تفاوت کی سچی کہانی، ان کی پاکستان سے بے لوث محبت کے نتیجے میں دربدری اور تباہی کی سچی کہانی، مقتدر حلقوں کے دلوں میں کچھ نرمی پیدا کرے۔

شاید حامد میر صاحب یا ان کے پایے کے صحافی کیمرے اور مائک لے کر "جنیوا کیمپ" کی اصلیت سے پردہ اٹھا سکیں اور اپنے آدھے سچ کو، جس میں صرف بنگالیوں سے ویسٹ پاکستانی اشرافیہ کا ناروا سلوک یا شیخ مجیب کی ابتدا بطور محب وطن پاکستانی بیان کرنا شامل ہے، کو نہتے بہاریوں پر (واضح رہے کہ سابقہ مشرقی پاکستان میں پھنسے پاکستانیوں میں صرف بہاری نہیں بلکہ یوپی اور ہندوستان کے دیگر علاقوں سے 1947 کے بعد آنے والے لوگ بھی شامل ہیں، مگر ان سب کو بہاری کہا جاتا ہے کیونکہ اکثریت ان کی ہی ہے، جبکہ کچھ حلقے انہیں غیر بنگالی اردو اسپیکرز بھی کہتے ہیں) گزری اور گزرتی ہوئی

قیامتوں کی حق پر مبنی رپورٹنگ کے ساتھ مکمل کر سکیں۔

یا شاید ایمان مزاری صاحبہ جیسی کوئی لائق اور بااثر وکیل ہمارا بھی کیس لڑلے اور ان کی طرح جلد از جلد عالمی میڈیا، لوکل عدالت اور دیگر حلقوں کی توجہ حاصل کرلے اور ہمارے لوگ بھی عالمی اداروں کے تعاون سے اپنی بات کر سکیں اور ان کے پاس بھی پاسپورٹ ہوں۔ شاید۔

ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور کرنے کو تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے، مگر ایک ایسے معاملے میں جس میں نہ تو مقامی نہ ہی عالمی اسٹیبلشمنٹ یا انسانی حقوق تک کے اداروں اور رکھوالوں کو کوئی دلچسپی نہ ہو، کون اپنا وقت برباد کرتا ہے؟

ایک بار پھر بچی کھچی ہمتوں کو یکجا کر کے اس سال ہر امن پسند شہری، ہر انسان دوست انسان اور خاص طور پر پاکستانی اور بنگلادیشی نوجوانوں سے چاہے وہ اپنے ملکوں کے علاوہ دنیا کے کسی بھی حصّے میں ہیں ہاتھ جوڑ کر خاص درخواست کر رہی ہوں کہ وہ صحیح تاریخ سے واقف ہوں۔

ماضی کو بدلا نہیں جا سکتا اور نہ ہی ماضی کو تاریخ سے بد دیانتی کر کے دکھانا چاہیے بلکہ ماضی سے سیکھنا ضرور چاہیے۔ سیکھنے کے لیے ذہن اور دل دونوں کو کشادہ کرنا پڑتا ہے۔ کیا آپ تیار ہیں؟

سولہ دسمبر 1971 سے پہلے اور بعد میں کیا ہوا؟ بہاری المیوں کے حوالے سے حقائق کی مختصر ترین تاریخ:

بہاری مسلمانوں کی بنگال آمد کے متعلق حقائق سے بے خبری یا ان کا توڑ مروڑ کر پیش کرنا

1. متحدہ ہندوستان میں بہار کے مسلمانوں کے پاکستان کے لیے "احساسِ اپنائیت" کے بارے میں بات نہیں کی جاتی، حالانکہ یہ ایک خاص اہمیت اور پس منظر رکھتا ہے۔ 1946 کے بہار قتل عام (جس پر میں نے لکھا ہے) نے پاکستان کے قیام میں ایک محرک کا کردار ادا کیا، اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلم لیگ کی کامیابی کو تقویت دی، جہاں یہ پہلے غیر مقبول تھی۔ **قائداعظم محمد علی جناح نے خود فرمایا:**

> **"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پاکستان میری زندگی میں قائم ہو جائے گا، لیکن بہار کے سانحے نے اسے ممکن بنا دیا۔"**

2. **بہاری مسلمانوں نے مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت نہیں کی؛ انہوں نے پاکستان کا انتخاب کیا - مشرقی پاکستان کا نہیں۔** جناح صاحب نے اڑیسہ، یوپی، بہار، اور دیگر علاقوں کے سرکاری ملازمین کو ہدایت دی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان منتقل ہوں۔ انہوں نے 1947 سے 1971 تک معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کیا، حالانکہ انہیں مغربی پاکستان کی طرح کوئی جائیدادیں بطور معاوضہ نہیں دی گئیں۔ اس وقت کی حکومت نے عام اردو بولنے والوں اور بنگالیوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔

3. **زبان کی تحریک کے دوران، مسعود محمود نے بنگالی طلبہ**

پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ یہی شخص بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے میں مشہور "وعدہ معاف گواہ" بن گیا۔ دوسری طرف، خودساختہ فیلڈ مارشل اور امر جنرل ایوب خان کی بدانتظامی پر نہ تو مرکزی دھارے کے میڈیا میں تنقید کی گئی اور نہ ہی فوجی تاریخ میں اسے چیلنج کیا گیا۔ اس کے سیاسی اثرات آج بھی نسل در نسل برقرار ہیں۔

4. اس کمیونٹی کے المیے اور صدمے کبھی ختم نہیں ہوئے۔ 1978 میں پاکستان کے فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے ان محب وطن پاکستانی بہاریوں کو بے وطن کر دیا۔ 2008 میں، بنگلہ دیش کی سپریم کورٹ نے ایک اہم فیصلہ سنایا، جس کے تحت 16 دسمبر 1971 کے بعد بنگلہ دیش کے نام نہاد کیمپوں میں پیدا ہونے والوں کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ یہ بھی رپورٹ ہوا کہ یہ قدم ایک بنگلہ دیشی مافیا نے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے اٹھایا تھا۔ یہ حق، جو ذاتی مفادات کے تحت دیا گیا، مکمل شہریت کے برابر نہیں۔

2009 کے "شہریت کے پروپیگنڈے" کی بات کی جائے تو یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ اگر مکمل شہریت دی جاتی تو بنگلہ دیش کو بہاری خواتین کی عصمت دری، بہاری بچوں کی ہلاکت، لوٹ مار، جانوں کے نقصان اور جائیدادوں کی ضبطی کا ازالہ کرنا پڑتا۔

نتیجتاً، یہ بے بس بہاری اپنی بدحالی کی زندگی گزارتے رہے، جنہیں غذائی قلت، بیماریوں،، ذہنی صحت کے مسائل اور دیگر مشکلات نے گھیرے رکھا ہے۔

5. جو چیز شرمناک حد تک عیاں ہے لیکن کم ہی بیان کی جاتی ہے، وہ میری بہاری بیٹیوں اور بہنوں کی زبردستی عصمت فروشی ہے۔ کسی نمایاں نسائی حقوق کی حامی یا انسانی حقوق کے علمبر دار نے ورثے، شناخت اور وقار کے نقصان پر سوگ نہیں منایا۔ ہماری خواتین کی عزت پامال کی گئی، لیکن نہ تو انہیں گنا گیا اور نہ ہی ان کے لیے کوئی افسوس کیا گیا۔

6. سولہ دسمبر 1971 کو باضابطہ ہتھیار ڈالا گیا۔ پاکستان دو لخت ہوا، سقوط ڈھاکہ پر اب تک نصاب تک میں سکوت ہے۔ اس کمیونٹی کو جو پاکستان کے جھنڈے سے دستبردار نہیں ہوئی پرقتل کیا گیا۔ یاد رکھیں مسلمان بنگالیوں نے مسلمان بہاریوں کا قتل کیا، چاہے ان کی ٹریننگ انڈیا نے کی ہو، لیکن اپنے ہی غیر بنگالی بھائی، بہنوں، کو لیگس پر بندوق مسلمانوں نے ہی تانی تھی۔

ہم لوگ کس کو سمجھائیں کہ صرف جغرافیہ نہیں بدلا ہماری شناخت اور حیثیت بھی بدلی۔ کیسا بدلہ لیا بنگالیوں نے؟ شکوہ پاکستان کے مراعات یافتہ طبقے سے جن کے ظلم کا شکار غریب پنجابی تک ہے اور برق گرائی گئی تو ہم امن پسند پڑھے لکھے مڈل کلاس اور محنت کی روزی کمانے والے بہاریوں پر۔

7. ابتدائی طور پر محصورین کا عالمی اداروں کی مدد سے محدود تعداد میں واپسی کا عمل ہوا، لیکن بعد میں یہ رک گیا، حالانکہ اس کے لیے فنڈز اکٹھے کیے گئے اور وعدے کیے گئے۔ ایسا کیوں ہوا اس کو بھی میں نے اپنے ایک حالیہ اردو مضمون میں

جو آئی بی سی میں چھپ چکا ہے اور دس دسمبر ۲۰۲۴ کو اپنے یوٹیوب چینل (کیف کام) پر ریلیز کی گی ایک انگریزی ویڈیو میں بیان کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قوم پرست نامی گرامی لوگوں کا احتجاج، منافق فیمینسٹ اور انسانی حقوق کے چیمپئنز، کوتاہ اندیش اپنے مفادات سے منسلک سیاست دانوں اور سمجھوتوں میں مقید سول اور ملٹری بیوروکریسی کی ملی بھگت سے آخرکار، ہمیں مکمل طور پر دھتکار دیا گیا۔

8. فارن آفس کو اس المیے کے امپیکٹ کا احساس تک نہیں۔

اکادمیا کے موقع پرست الگ ہیں۔ بھارت نواز حسینہ واجد کی حکومت ختم ہونے پر پاکستانی میڈیا اور معتبر حلقوں کا یوفوریا دیدنی رہا اور قبل فہم بھی۔ لیکن اب تک میری نظر سے پاکستانی بہاری محصورین سے معافی ان کے نقصانات کی تلافی کی بات نہیں گزری۔ بحالی اور آبادکاری تو دور کی بات ہے مسلمان اکثریت کا یہ ملک خداداد صرف تین لاکھ بے کس لوگوں کو محبّت اور عزت سے نہیں دیکھ سکتا۔ کبھی محبّت سے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔

ہر طبقہ فکر جس میں مذہبی جماعتیں اور مہاجر کی محرومی پر سیاست کرنے والی مختلف اشکال اور القاب کی سیاسی جماعتیں تک شامل ہیں انھوں نے ترپین برسوں میں بنگلہ دیش کے کیمپ کے نام پر قائم ڈربوں میں جہاں سانس لینا تک محال ہے وہاں پاکستان کی محبّت میں معتوب کمیونٹی کو فراموش کر دیا۔

ہم بہاریوں سے پہلی دو ہجرتوں میں زمین چھینی گئی، مگر پاکستان وطن رہا اور اس تیسری "ہجرت" میں ہم بے زمین ہونے کے ساتھ ساتھ بے وطن بھی ہوئے۔ **سِتَم بالائے سِتَم** یہ بھی ہے کہ ہماری مظلومیت کی بات کرنے والا کوئی بھی نہیں۔

16 دسمبر 1971ء 16 دسمبر 2024 تک-تذلیل، توہین اور گمشدہ شناختوں کے 19,359 دن ہیں اور بے زمین سے بے وطن ہونے تک کی بے امان لوگوں کی فریاد نہ کوئی سنے والا ہے نہ سنانے والا۔

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے
(محسن بھوپالی)

Prof. Nazeer Siddiqi and Farhat Perveen Mallick

Parents of Dr. Rakhshinda Perveen

The late Prof. Nazeer Siddiqi built a house in Dhaka.

- **Original Address**: 69/C, Ayub Avenue, Near Ayub Gate, Muhammadpur, Dhaka, East Pakistan
- **Latest Address**: 69/C, Asad Avenue, Near Asad Gate, Muhammadpur, Dhaka, Bangladesh

  Ayub Gate and Ayub Avenue were named after Field Marshal Ayub Khan, the second President of Pakistan, who served from 1958 to 1969.

پاکستان: ہم بہاریوں کی یکطرفہ محبّت

میں کون ہوں ؟

پاکستان سے غیر مشروط محبّت کرنے والی ، ایک انسان دوست اور بے ثمر کاموں کی عادی ایک فیمنسٹ۔ میں ہوں ڈاکٹر رخشندہ پروین، جو ایک معالج تھی ۔ کیونکہ میرا ''ڈومی سائل'' مجھ کو سرکاری ملازمت نہیں دلا سکتا تھا سو میں نے کلینکل میڈیسن سے ''ہجرت'' کر کے سماجی ترقی کی انڈسٹری میں قدم رکھا۔ میں سماجی ترقی، پبلک ہیلتھ اور صنفی امور کی ماہر بن گئی۔ میں صرف 18 ماہ کی تھی جب میرے ابّو جان نے ایک بنگالی خیر خواہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بائیس دسمبر 1969 میں ڈھاکہ چھوڑ دیا۔ اس ہجرت میں انہوں نے اپنی کتابیں، دیگر سامان اور محمّد پور ڈھاکہ میں اپنی ذاتی ملکیت کا گھر پیچھے چھوڑ دیا۔ میرے والدین کے لیے یہ دوسری ہجرت تھی اور میرے دادادادی اور نانانانی جن کا تعلق بہار سے تھا ان کے لیے ان کی زندگی میں تیسری۔ ابتدا ہی سے، بے شناخت ہونے کا کرب اور اس سے نباہ کرنے کے لیے جرات اور استقامت جو مجھے کو اپنے والد پروفیسر نظیر صدیقی مرحوم سے ورثے میں ملی میری اپنی کہانی کا مرکزی حصہ بھی بن گئی۔

پنجابی زبان سے مجھے عشق ہے۔ پوٹھواری کی پوری سمجھ بوجھ ہے اور لائلپوری / فیصل آبادی پنجابی میں جگتیں بھی مار سکتی ہوں۔ سرائیکی سننے اور بولنے میں اچھی لگتی ہے۔ سندھی موسیقی اور ادب کی شیدائی ہوں۔ پشتو اور بلوچی کسی حد تک سمجھ سکتی ہوں اور ان زبانوں کا ادب تراجم سے پڑھا بھی ہے۔ دیگر پاکستانی زبانوں اور لہجوں کو پہچان سکتی ہوں۔ پھر بھی شناخت کا حوالہ ''مہاجر'' ہونا رہا۔ میں بچپن میں ایک بار اپنے ابو جان سے یہ سن کر بہت روئی تھی کہ ہمارا کوئی گاؤں نہیں ہے۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں لکھتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایوارڈ یافتہ ٹی وی پروڈیوسر اور صبح کی لائیو نشریات اور حالت حاضرہ کے پروگرامز کی پہلی خاتون سولو اینکر بھی رہ چکی ہوں۔ سماجی کارکن کے طور پر، میں امن، سچائی، اور مساوات کی حامی ہوں۔ میری کاوشوں اور پروجیکٹس کے بارے میں جاننے کے لیے آپ ان

web sites: https://drrakhshinda.mystrikingly.com
www.creativeangerbyrakhshi.com.pk
Youtube Channel: https://www.youtube.com/channel/UCR0HiPAzmjTBGrCbEz-KF4g

دو ویب سائٹس اور کیف کام کے یوٹیوب چینل کو دیکھ سکتے ہیں۔

تین دہائیوں سے بھی زائد عرصے سے پاکستان کے ہر خطّے کی غریب اور محکوم کمیونٹیز کے لیے فیلڈ میں صحت ،تعلیم اور روزگار کے حوالوں سے کام کرتی رہی ہوں۔ محروم آوازوں کو ہمدلی کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ اپنی تقاریر، وی لاگز، پوڈکسٹس، ڈیجیٹل فلمز اور تحاریر سے بہاری المیے کو، ان کی نسل کشی کو جس کو مہارت سے چھپایا گیا ہے اور ''محصورین'' کی واپسی اور ان کے اپنانے کے مطالبے کو بار بار دہراتی ہوں کہ شائد میری آواز وہاں وہاں تک پہنچ جایے جہاں جہاں فیصلے ہوتے ہیں۔ ایک بچی اور نوجوان خاتون کے طور پر میں نے بہت مشکل زندگی جھیلی اور نسلی امتیاز کا بھی سامنا کیا۔ پروفیشنل زندگی میں ناقابل یقین حد تک تذلیل، استحصال اور مظالم برداشت کرنے کے باوجود جس کی تفصیلات میں شائد مرتے دم تک سامنے نہ لاسکوں پاکستان کے لیے میری چاہت کبھی متزلزل نہیں ہوئی، میں اپنے اس خبطی خمیر پر نازاں ہوں اور یہ میری بہاری برادری کی خوبیوں کا ایک عکس بھی ہے۔ **پاکستان زندہ باد**